OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۵۲ء ۰۳۵ Accession No. ۱۲۳۶۶
ط — ع 1٦366

Author عبداللہ فاروقی

Title طوفان ارم ۱۹۲۸ء

This book should be returned on or before the date last marked below.

مغل حکومت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ

ظفر کا افسانۂ غم

غدر کی ماری شہزادیوں، شہزادوں، اور بیگمات کا دردناک انجام

مؤلف

مولانا عبید اللہ فاروقی ایڈیٹر خاتون مشرق دہلی

پبلشر

دفتر آستانہ جامع مسجد دہلی

قیمت:- ۲ دو روپے

اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

۳۶۶ — ۱۱

بہ سلسلۂ یادگار
شہیدانِ غدر ۱۸۵۷ء
اور
مظلومین دہلی، یو، پی

اس کتاب کے

تین چار ایڈیشن ۴۷ء سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

تیسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔

یہ چوتھا ایڈیشن ماہ جون ۱۹۵۷ء میں دفتر آستانہ سے شائع ہو رہا ہے،

عبداللہ فاروقی

پیش لفظ

یہ کتاب بہادر شاہ کا افسانۂ غم میں نے ۱۹۳۸ء میں لکھی تھی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک اس کتاب کے تین چار ایڈیشن چھپے اور فروخت ہو گئے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک اس کتاب کو روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے میں نہیں چھپوا سکا۔ میرے لئے خوشی کا باعث ہے کہ میری درخواست پر صاحبزادہ نقیب الاولیاء مسٹر محمد مستحسن فاروقی سجادہ نشین حضرت شیخ کلیم اللہ ولی شاہجہاں آبادی مالک و مدیر رسالہ آستانہ اس کتاب کو چھپوا کر اپنے مشہور تبلیغی ادارہ سے شائع فرما رہے ہیں۔

اس کتاب میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری دہلوی مرحوم۔ اور مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی رح کی لکھی ہوئی چند دردناک داستانیں بھی غدر کی ماری شہزادیوں اور بیگمات کے متعلق شامل کر دی گئی ہے۔ کوشش کی جائیگی کہ آئندہ ایڈیشن میں کچھ اور تاریخی مضامین اور روح فرسا مظالم کے مناظر پیش کئے جائیں۔

عبداللہ فاروقی

اردو بازار دہلی، ۱۵ جون ۱۹۵۷ء

سلام

سلام بہادر شاہ ظفر کے لڑکوں اور پوتوں پر جن کو مقبرہ ہمایوں سے انگریزی فوجوں نے گرفتار کیا اور دہلی دروازہ کے باہر جن کے سر تن سے جدا کر کے بہادر شاہ کے سامنے پیش کیے گئے۔

سلام اُن ہزاروں یُو۔ پی اور دہلی والوں پر جو مُلک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے جنگ آزادی میں شہید ہو گئے۔

سلام اُن مظلُوم خواتین پر جن کو غدر ۵۷ء میں ان کے وارثوں نے اس لئے قتل کر دیا کہ وہ اغوا نہ کی جائیں اور ان کی بے عزتی نہ ہو۔

سلام بہادر شاہ بادشاہ پر جس کا تخت و تاج چھنا۔ جس پر مقدمہ چلا۔ اور جو رنگون کے قید خانہ میں حسرت و بے کسی کی موت مر گیا۔

سلام بہادر شاہ کی رفیقۂ حیات "زینت محل" پر جو آخر عمر تک بہادر شاہ کی غمگسار بن کر بہادر شاہ کے ساتھ قید رہی۔

سلام راجہ بلب گڈھ۔ نواب جھجر جیسے والیان ریاست پر جو مُغل حکومت کو بچانے کے لئے قربان ہو گئے۔ اور جن کو نہایت ہی ظالمانہ طریقہ پر چاندنی چوک میں پھانسیوں پر لٹکایا گیا۔

سلام پُرانی دہلی کے در و دیوار کو جو آج بھی غدر ۵۷ء میں شہید ہونیوالوں کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔

عبداللہ فاروقی

۱۵ اپریل ۵۷ء

غدر ہونے کے اسباب

انقلاب ۱۸۵۷ء کے واقعات پہ ہندوستانی اور انگریز مورخین نے ایک دو نہیں سینکڑوں کتابیں لکھی ہیں۔ اور اپنی اپنی سمجھ اور نظر کے مطابق مختلف قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انقلاب کا سبب صرف گائے یا سور کی چربی کے کارتوسوں کا معاملہ نہ تھا۔ جس نے میرٹھ چھاؤنی سے بغاوت کا آغاز کیا اور دہلی سے ایک قیامت خیز طوفان انقلاب کی شکل میں منتقل ہو کر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا البتہ یہ واقعہ انقلاب کا محرک ثابت ہوا تھا دراصل ہندوستان پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی زیادتیوں نے ہندوستان میں اضطراب اور بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی تھی —

طوائف الملوکی عام تھی۔ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ بے نور ہو کر ٹمٹما رہا تھا۔ اور ہندوستان کے باشندے انگریزوں کے اقتدار کو ایک خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ ہندوستانیوں کی

کوئی منظم طاقت اور جماعت موجود نہ تھی۔ اور بغاوت اتفاقی طور پر پھوٹ پڑی تھی۔ اس لئے ناکامی ہونی تھی۔ وہ ہوئی۔

ہیجان انگیز افواہیں

کوئی بڑا طوفان یا زلزلہ آنے سے کچھ پہلے فضاؤں اور جانداروں کے احساسات پر ایک ہیجانی کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے ایسے موقعہ پر نہ دکھائی دینے والے کسی بڑے خطرے کا عجیب و غریب احساس کتوں پرندوں اور حشرات الارض پر بھی چھا جاتا ہے اور وہ مختلف قسم کی آوازیں نکالنے لگتے ہیں۔ یہی حال انسان کے احساس کا بھی ہے۔

دہلی قدیم کے خوش باش اور پُر امن باشندوں کو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے کیا معلوم تھا کہ عنقریب دہلی پر ایک قیامت نازل ہونے والی ہے جو ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دے گی۔ لاتعداد عورتیں بیوہ اور بے شمار بچے یتیم بن جائیں گے۔ دلّی جیسا آباد اور بارونق شہر ایک کھنڈر بن جائے گا۔ سلطنت مغلیہ کا آخری خاندان تباہی و بربادی کی نظر ہو کر بھیک مانگتا پھرے گا۔ اور کوئی ان کو بھیک تک نہ دے سکے گا۔ بہادر شاہ ظفر کے بچے گولیوں سے اُڑا دیئے جائیں گے۔ لیکن دہلی والوں کا دل غیر محسوس طریقے پر کسی آنے والے بڑے خطرے سے لرز رہا تھا۔ وہ سینکڑوں ہزاروں عجیب و غریب افواہیں جو ۵۷ء کے آغاز موسم بہار سے پہلے دہلی میں حیرت انگیز طریقہ پر مشہور ہو رہی تھیں۔ دلّی والوں کی اس لرزش قلب کا نتیجہ تھیں۔

بیرُونی حملوں کا خطرہ

وہ افواہیں بھی ایسی تھیں جن کے سر اور پیر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ مثلاً کہیں سُنا جاتا تھا ترکی اور فرانس نے باہم معاہدہ کر لیا ہے کہ شہنشاہ ایران کو ساتھ لے کر ہندوستان پر حملہ کر دیں گے چنانچہ شاہ کجکلاہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ امیرِ کابل نے ہندوستان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے کہیں سُنائی دیتا کہ زارِ رُوس حملہ کرنے والا ہے کسی گوشہ سے صدا اُٹھتی کہ قلعہ معلّٰی میں شب و روز ایرانیوں کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ہے اور شاہ حسن عسکری صابری خاندان کے بزرگ ان کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں ایک صبح کو جب لوگ نمازِ فجر سے فارغ ہُوئے کیا دیکھتے ہیں کہ جامع مسجد دہلی کے دروازہ پر ایک اشتہار چسپاں ہے جس میں لکھا تھا۔ شاہ کجکلاہ ایران سے فوج لئے آ رہا ہے مسلمانوں کو ان کی فوج سے مل کر انگریزوں سے جنگ کرنی چاہیئے۔ اس قسم کی بے سروپا افواہیں خصوصیّت کے ساتھ دہلی میں بہت عام ہو رہی تھیں۔ اور ہر کوچہ و بازار میں ان کا چرچا تھا۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ ہر شخص کسی بڑے انقلاب کی آمد کا اندیشہ کر رہا تھا۔

دانتوں سے کاٹے جانے والے کارتوس

ان افواہوں کے ساتھ یہ بات عام طور پر مشہور ہو چکی تھی کہ انگریز ہندوستانی

رعایا کے مذہب تمدن اور معاشرت کو آہستہ آہستہ فنا کرکے یہاں انگریز
چاہتے ہیں۔ اور سارے ملک پر اپنی حکومت قائم کرلیں گے۔ جمہور کی یہ را
یا نہیں۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس قسم کے خیالات فوج میں بھی پھیل گئے تھے۔ انگلستان سے کچھ
نئے کارتوس آئے ہیں۔ جنھیں استعمال کرنے کے لئے دانت سے کاٹنے ک
ان کارتوسوں کے متعلق یہ مشہور ہوگیا۔ کہ ان میں گائے اور سؤر کی چربی
اور ان کو رائج کرنے کی غرض یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں بے دین ہوج
آگ کی طرح تمام ملک میں پھیل گئی۔ ہندوستانی فوج میں بے چینی اور ر
سے تھی۔ اس افواہ نے آگ پر پٹرول کا کام کیا۔ فوج کے سپاہی کارتو
سے انکار کر بیٹھے۔ انگریز افسروں نے ان کے استعمال کرانے پر ضد کا
قابو سے باہر ہوگئے۔

چھاؤنی میرٹھ سے بغاوت کا آغ

جب سپاہیوں کو ان کارتوسوں کے استعمال پر مجبور کیا گیا اور وہ نہ
۱۸۵۷ء کو انکار کرنے والے سپاہی گرفتار کرکے حوالات میں بند کردیئے گ
انھیں دس سال قید سخت کا حکم سنایا گیا۔ اور سر میدان وردیاں اتار کر بیڑ
گئیں جبر و زیادتی سے اپنا کام نکالنے کی کوشش کرنے والے آنیوالی تلخ گ
ہوتے ہیں۔ یہ خبر مشہور ہوچکی تھی۔ کہ کل کو انکار کرنے والے پھر گرفتار کرکے ق

۱۰ مئی کی صبح کو جب کہ انگریز افسر اتوار کی عبادت کے لئے گرجا گھر گئے ہوئے تھے میرٹھ کی فوج بارگوں سے نکل کھڑی ہوئی اور جیل خانے کے قفل توڑ کر قیدیوں کو نکال لائی۔ بارگوں کے چھپروں میں آگ لگادی۔ انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو سامنے نظر آیا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میرٹھ میں ۱۰ مئی کی شام تک قتل و خونریزی کا وحشت ناک ہنگامہ برپا رہا۔

باغی فوج دہلی میں گھس آئی

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء (۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ) کی گرم صبح کو جبکہ شاہ ظفر نماز سے فارغ ہو کر دیوان خاص کے جھروکے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ جمنا کے پُل کی جانب آگ کے شعلے اُٹھتے ہوئے دکھائی دیئے بادشاہ سلامت نے حال معلوم کرنے کے لئے سوار بھیجے۔ تو پتہ چلا کہ میرٹھ کی فوج باغی ہو کر یہاں آگئی ہے اور اس نے وہاں انگریزوں کا قتل عام کرنے کے بعد یہاں گھاٹ کے انگریز حاکم کو بھی قتل کر دیا ہے اور اس کے بنگلے کو آگ لگا دی ہے جس سے یہ شعلے بلند ہو رہے ہیں یہ سن کر شاہ ظفر لرز گئے اور خُدا سے امن کی دُعائیں مانگنے لگے۔

باغی فوج شام کو میرٹھ سے روانہ ہو کر صبح ہوتے ہی دہلی پہونچ گئی تھی۔ اس موقع پر بعض انگریز افسروں نے کسی نہ کسی طرح کمشنر دہلی کے نام ایک خط بھیج دیا تھا جس میں بغاوت کی اطلاع دے کر یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ کہ باغی دہلی کی طرف رُخ کریں گے وہاں ان کی روک تھام ہونی چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ کمشنر صاحب کے ہاں یہ خط ایک بجے

رات کو پہونچا صاحب بہادر اس وقت خوابِ شیریں میں مدہوش تھے۔ اگرچہ انہیں بیدار کر کے خط حوالہ کیا گیا مگر وہ خط کو جیب میں ڈال کر پھر نیند میں مدہوش ہوگئے۔ ادھر صبح تک معاملہ دگرگوں اور قابو سے باہر ہوگیا تھا۔

بادشاہ ظفر کی حیثیت اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک وظیفہ خوار کی تھی۔ دراصل انگریز قوم کے ہاتھوں میں حکومت جا چکی تھی۔ بادشاہ اور ان کے خاندان کو قلعہ معلّٰی میں ایک بے تعلق شاہی خاندان کی طرح رہنے کی اجازت تھی۔ جب بادشاہ سلامت کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو وہ حیرت اور غم و غصّہ کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے پُل توڑنے اور شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا۔ تاکہ دلّی اس بغاوت سے الگ رہے لیکن باغی کشتیوں کے پُل سے جمنا کو پار کر کے سلیم گڑھ کے نیچے ہوتے ہوئے لال قلعہ تک آپہونچے پہلے انھوں نے بادشاہ سلامت کو سلامی دی اس کے بعد فریادی ہوئے کہ ہم انصاف کے امیدوار ہیں۔ ہم نے سر دھڑ کی بازی لگا کر کلکتہ سے پیشاور تک انگریزوں کی عملداری کرادی ہندوستان پر ان کا تسلط ہم فوجیوں کی قوتِ بازو سے اور ہزاروں سر کٹانے سے قائم ہوا۔ مگر مکار انگریز ہمارے احسانوں کا بدلہ یہ دے رہے ہیں کہ ہمارے دین و مذہب کے خراب کرنے کے درپے ہوگئے۔ باغیوں نے بادشاہ سلامت کے سامنے رو رو کر کارتوسوں کا معاملہ پیش کیا۔ اور بتلایا کہ ہمیں کارتوسوں کے استعمال کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ اور انکار کرنے پر تشدّد کر دیا گیا۔ یہ صورتِ حال یقیناً ناقابلِ برداشت تھی۔ اب ہندوستانی فوج انگریزوں کی اطاعت سے منحرف ہوکر تمام ملک میں بغاوت پیدا کر چکی تھی۔ باغیوں نے کہا کہ ہم حضور کے سامنے فریاد لے کر آئے ہیں تاکہ آپ ہماری سرپرستی کریں۔ اور ہمارا انصاف فرمائیں۔

بہادر شاہ کا دُرویشانہ جواب

اس وقت بادشاہ کے اُستاد زادے سیّد ظہیر الدین ظہیرؔ دہلوی حاضرِ خدمت تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''داستانِ غدر'' میں بادشاہ کا جواب بیان کیا ہے جو آپ نے باغیوں کو دیا تھا اس جواب سے بادشاہ کی بے بسی مجبوری اور انقلاب سے بے تعلقی کا بظاہر اظہار ہوتا ہے سید ظہیرؔ دہلوی نے بادشاہ کی زبان سے جو الفاظ سُنے تھے۔ اُنھیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھ لیا تھا بادشاہ کا درویشانہ جواب یہ تھا۔

> ''سُنو بھائی'' مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں اور ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں بادشاہت تو بادشاہوں کے ساتھ ختم ہو گئی میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے آباؤ اجداد کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے الگ ہو کر خود مختار صوبے دار بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے مُلک نکل گیا۔ قوت لایموت کو محتاج ہو گئے۔ خصوصاً میرے جدِ بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کر کے نابینا کیا ہے۔ تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا اور اُنھوں نے اس نمک حرام کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا۔ چند سال مرہٹے بادشاہ کی

> جانب سے مختار ہے۔ مگر بادشاہ کی طرح ملک کا بندوبست نہ کر سکے لاچار ہو کر میرے دادا نے سلطنت انگریزی کی طرف رجوع کیا۔ اور انگریزوں کو طلب کر کے اپنے گھر کا مختار بنایا۔ اور ملک ان کے سپرد کیا۔ انگریزوں نے حسب دلخواہ اخراجات شاہی کا بندوبست کر دیا۔ اس روز سے ہم لوگ بہ عیش و عشرت تمام زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ سروکار نہیں۔“

میں تو ایک گوشہ نشین فقیر ہوں مجھے ستانے کیوں آئے میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں۔ فوج نہیں کہ تمہاری مدد کروں۔ ملک نہیں کہ تحصیل کے لئے نوکر رکھوں میں تو کچھ نہیں کر سکتا مجھ سے کسی قسم کی توقع نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں ہاں ایک بات میرے امکان میں ہے۔ وہ یہ کہ میں تمہارے درمیان پڑ کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ میں نے ریذیڈنٹ کو بلوایا۔ ہے وہ میرے پاس آنے والا ہے پہلے میں ان سے دریافت کر لوں ان سے مجھے فتنہ و فساد کا حال معلوم ہو جائے گا۔ اور خدا نے چاہا تو میں اس بغاوت کو رفع دفع کرا دوں گا۔“

ریذیڈنٹ سے بہادر شاہ کا خطاب

اس اثنا میں فریزر صاحب ریذیڈنٹ مع قلعہ دار صاحب دیوان خاص میں داخل ہوئے بادشاہ نے ان سے یوں خطاب کیا۔

کیوں بھئی یہ کیا فتنہ اور فساد برپا ہوگیا۔ یہ مذہب کا جھگڑا کیسے اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مُقدّمہ دین و آئین کیلیے۔ تعصب بُری شے ہے۔ اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے مُبادا ہندوستان میں بغاوت ہمہ گیر ہو جائے۔ اور لاکھوں انسانوں کا کشت و خون ہو۔ یہ لوگ جاہل ہیں فرقہ سپاہ جانور ہوتا ہے ان سے تھپک کر نرمی سے کام نکالنا چاہیئے۔ ان کو ہدایت کردو یہ لوگ فساد سے باز آئیں۔ تعجب ہے کہ تم کو اس معاملے کی ابتک خبر نہیں۔

باغیوں کا اشتعال اور قتل و غارتگری

بہادر شاہ کی امن پسندی کا یہ عالم تھا۔ کہ باغیوں کا اشتعال ایسا نہ تھا کہ فہمائش اور وعظ و پند کے معمولی تذکروں سے سرد پڑ جاتا۔ ان کے دلوں میں بغاوت کی خوفناک آگ بھڑک رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ انگریزی عملداری سے بدگمان ہو کر ان سے اپنے مذہب و ایمان کے لئے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ ان کے مذہبی اور قومی جذبات کو تشدد کے ذریعہ ٹھکرایا گیا تھا۔ وہ بغاوت اور انقلاب کا مکمل عزم کر کے نکلے تھے انھوں نے میرٹھ سے بغاوت کا آغاز کر کے فوجی ڈسپلن کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ انگریز افسروں کو قتل کر کے آ گئے تھے۔ انھیں یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی۔ کہ ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا جائے گا۔ جب انسان کے دل و دماغ پر مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ تو اس کی زبان دراز ہو جاتی ہے اور وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جب فوج افسروں سے باغی ہو جاتی ہے تو اس کی بندوقوں کی باڑ افسروں کی طرف ہوتی ہے۔ بغاوت کو فرو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے صاحب، ریذیڈنٹ نے بذاتِ خود باغیوں کو فہمائش کی۔ مگر

کچھ اثر نہیں ہوا۔ ایک سپاہی نے بندوق تان کر ان پر فیر کیا مگر اس لمحہ وہ بچ گئے۔ اور بادشاہ سے کچھ عرض معروض کے بعد شہر کے بندوبست کے لئے قلعہ معلّٰی سے باہر نکلے باغیوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اور فوراً شہر میں قتل و غارت کا طوفان برپا ہو گیا۔ صاحب ریذیڈنٹ۔ قلعہ دار، دیسی عیسائی فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ دوکانیں لوٹی گئیں۔ ہنگامے اور تصادم شروع ہو گئے۔ اور سارے شہر پر بغاوت کا دیوتا اپنی خونی آنکھوں سے آگ کے شعلے برسانے لگا۔

لال قلعہ پر باغیوں کا تسلّط

باغی قلعہ معلّٰی کے اندر داخل ہو گئے۔ اور ملازمین شاہی سے مدد مانگی۔ انھیں رسد کی ضرورت تھی۔ اس شرط پر امداد کا اقرار کیا گیا کہ قتل و غارتگری کا بازار بند کیا جائے جب بھوکے باغی اس پر کسی قدر آمادہ ہوئے۔ تو شہر میں منادی کی گئی۔ کہ خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکم "کمپنی کا" کسی پر کوئی ظلم نہ کرے۔ ورنہ ملزم شاہی قرار دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی بازاروں میں پہرہ لگا دیا گیا۔

حکم ...... ؟ طاقت اور اختیار سے بیگانہ تھے۔ بادشاہ کی بے بسی معلوم تھی۔ باغی اپنی حرکات سے باز نہ آئے۔ انھوں نے بنک لوٹ لیا۔ بہت سے انگریزوں کو گرفتار کر کے قلعہ میں بند کر دیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اوپر کی تحریروں سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ بہادر شاہ اگرچہ انگریزوں سے ناراض تھے۔ مگر باغیوں کی ان حرکات کے حامی نہ تھے اور چاہتے تھے کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے لیکن اس وقت

لال قلعہ میں باغیوں کا عمل دخل تھا بادشاہ بالکل بے بس و مجبور تھے۔ باغی چاہتے تھے کہ بادشاہ اور ان کے ملازمین انگریزوں سے جنگ کرنے میں ان کا ساتھ دیں۔ ملازمین شاہی اور خاندان شاہی کے شہزادے باغیوں کے حامی بن گئے تھے۔ مرزا مُغل اور مرزا سلطان وغیرہ شہزادے باغی فوج کے افسر بنا دیئے گئے۔ اور مجبور بادشاہ کو بجبر و اکراہ شہزادوں کے ایما پر تمام سرگرمیوں کی رضامندی دینی پڑی۔ بادشاہ سلامت کے نام سے احکامات جاری کئے گئے باغیوں نے بادشاہ اور ان کے ہم خیالوں کو دھمکیاں دیں الزام لگایا۔ کہ تم انگریزوں سے ملے ہُوئے بے دین ہو ظہیر دہلوی لکھتے ہیں۔ کہ کئی بار باغیوں نے بادشاہ اور ہم لوگوں کو گھیر کر سخت و سُست بھی کہا تھا۔ بہرحال لال قلعہ پر باغیوں کا تسلط تھا۔ اور بہادر شاہ بڑی نازک پوزیشن میں تھے۔ تمام باغیانہ سرگرمیاں انھیں کے نام سے جاری تھیں۔ دراصل وہ نہ انگریزوں کے معاون تھے۔ نہ بغاوت کے حامی۔ وہ جانتے تھے کہ اس بغاوت کا انجام بہت ہولناک نتائج برآمد کرے گا۔ تیموری خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا۔ قلعہ معلی کی چار دیواری ماتم کدہ بن جائے گی۔ سلطنت مغلیہ کا آخری ٹمٹاتا ہوا چراغ بادِ صرصر کے جھونکوں سے بُجھ جائے گا۔ اور جو جو درد انگیز مصائب نہ آئیں وہ کم ہیں۔ اس احساس سے بادشاہ قبل از وقت آنے والی تباہی اور بربادی کا نقشہ اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر باغیوں اور شہزادوں کے جاری کردہ احکامات پر دستخط کر دیتے تھے۔

شاہ ظفر کی کس مپرسی

ایک صادق البیان گواہ اپنے چشمِ دید حالات یوں بیان کرتا ہے کہ بادشاہ

غریب کا یہ حال تھا۔ کہ حیران پریشان محل میں رہتے تھے۔ باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ ہر وقت مغموم رہتے تھے۔ کبھی کبھی وقت شب گھڑی دو گھڑی تسبیح خانہ میں تخلیہ میں آکر بیٹھا کرتے تھے۔ اور ناروا حرکتوں پر بُرا بھلا کہتے تھے۔ ایک دن جہاں پناہ نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونا ہے حمید بتاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضور ڈیڑھ سو برس بعد اقبال یاور ہوا ہے گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے۔ بادشاہ نے ارشاد فرمایا تم لوگ نہیں جانتے ہو جو کچھ میں جانتا ہوں مجھ سے سُن لو میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ بنائے فساد مال و دولت خزانہ ملک سلطنت ہوا کرتے ہیں میرے پاس ان میں سے ایک چیز بھی نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔" ؎

کس نیاید بخانۂ درویش
کہ خراج زمین و باغ بدہ

ہولناک پیشین گوئی

اب جو منجانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی۔ اور دلی میں آکر بھڑکی۔ فتنہ برپا ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلک کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے آج تک سلاطین مغل کا نام چلا آتا ہے اور اب آئندہ کو نام و نشان یکقلم معدوم نابود ہو جائیگا یہ فرقہ سپاہ جو مالک سے منحرف ہو کر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں کوئی دن میں ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ میرا کیا ساتھ دیں گے۔ میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے ان کے جانے

کے بعد ظالم انگریز میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑیں گے۔ اور کوئی باقی رہ جائے گا تو آج میرا قول یاد رکھو۔ کہ روٹی کا ٹکڑا منہ میں لوگے اور مُنہ سے اُڑ کر دُور جا پڑے گا۔ بادشاہ سلامت یہ درد انگیز بیان فرما کر پھر محل میں داخل ہو گئے۔

درحقیقت بہادر شاہ اپنی برائے نام بادشاہی کی حقیقت، انگریزوں کے قائم شدہ اقتدار، اور اپنی بے بسی اور مجبُوری سے اچھی طرح واقف تھے باغی بادشاہ سلامت کے نام سے فائدہ اُٹھا کر بغاوت کو پھیلانے اور کامیاب بنانے کی کوشش میں تھے لیکن بادشاہ کو یہ ہولناک انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ میرے نام کا استعمال لال قلعہ میں باغیانہ سرگرمیاں بالآخر مجھ ہی کو اصل مجرم قرار دیں گی۔ اور مُغل خاندان تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

اِردگرد کے لوگ اور بادشاہ کی بے بسی

یہ بات اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ بہادر شاہ کو اس انقلاب اور بغاوت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور نہ کسی تحریک میں بادشاہ کو کوئی دخل تھا۔ باغی قلعہ معلّٰی پر اس قدر حاوی ہو گئے تھے کہ بادشاہ اور ان کے برائے نام چند ساتھی بالکل کاٹھ کی گڑیا بنے ہوئے تھے۔ بادشاہ سے جبراً احکام صادر کرائے جاتے تھے کسی کو چُون و چَرا کی گنجائش نہ تھی۔ بالآخر بادشاہ کو اپنے اردگرد کے لوگوں ہی کی وجہ سے مجُرم بننا پڑا۔

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

پہاڑی پر انگریزی توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور باغیوں نے قلعہ پر توپیں نصب کیں دونوں جانب سے وہ خوفناک گولہ باری ہوئی۔ کہ دلی والوں کو قیامت کا منظر نظر آنے لگا رعد و برق کی طرح گرجتے اور تڑپتے توپ کے گولے شہر والوں کے عین سر پہ سے گذرتے تھے عورتیں سہم جاتیں اور بچے چیخ اٹھتے اور مرد کانپ جاتے تھے انگریزی فوجوں نے دہلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ شہر کے مسلمان باغیوں کے ساتھ صبح کو انگریزی فوج کے مقابلے کے لئے نکلتے تھے۔ اور شام کو اپنی تعداد گھٹا کر واپس آجاتے تھے۔ محاصرین میں بھی کمی ہوئی۔ لیکن ان کے پاس کئی ہزار سوار پیادہ فوج کی کمک آگئی۔

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کی خونریز لڑائی میں انگریزوں کے چھیاسٹھ افسر اور گیارہ سو چار مجروح و مقتول ہوئے آخر انگریزوں نے شہر کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶ ستمبر سے ۱۸ ستمبر تک شہر کے اندر معرکہ کارزار گرم رہا۔ باغیوں کو شکست ہو گئی۔ اور ۱۹ ستمبر کو ان کے پاس کوئی مورچہ باقی نہ رہا۔ تمام شہر پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

بادشاہ کو دم دلاسے

۱۹ ستمبر کی رات بہادر شاہ کے لئے بڑی مُصیبت اور قیامت کی رات تھی۔ بادشاہ نے راتوں رات لال قلعہ سے نکل جانے کا ارادہ کیا لیکن عین وقت پر بخت خاں (جس کو باغی لارڈ گورنر کہتے تھے) بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بادشاہ کو درد ناک پیرایہ میں سمجھایا۔

> اگرچہ دُشمنوں نے شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن اس سے ہمارا کوئی بڑا نقصان نہیں ہُوا۔ ہندوستان ہمارے ساتھ ہے ہر شخص آپ کی جانب دیکھ رہا ہے۔ آپ بلا تردُد میرے ساتھ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں کی آڑ سے ایسی مورچہ بندی کروں گا کہ انگریز کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ دہلی پایۂ تخت ہے کوئی فوجی قلعہ نہیں ہے۔ اور جنگ کے لئے نہایت نامناسب ہے۔ ہم نے چند مہینہ تک شہر کو محفوظ رکھا۔ یہی بڑی بات ہوئی ہم نشیب میں تھے۔ اور انگریز پہاڑی پر تھے اور اگر کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی پر ہوتی تو اس کو دہلی فتح کر لینا کوئی دُشوار نہ تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہُوئی کہ حضور کے صاحبزادے مرزا مغل بہادر میری مرضی کے خلاف فوج کے کمانڈر انچیف بنا دیئے گئے۔ اور وہ فنون

حرب سے ناواقف تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ سرکش اور خود سر سپاہیوں کو کس طرح قابو میں رکھا جاتا ہے ان کو کیوں کر مطیع اور فرمانبردار بنایا جاتا ہے میری زندگی کا بڑا حصّہ فوجی خدمات میں صرف ہوا ہے اگر صاحب زادہ صاحب میرے انتظامات میں رخنے نہ ڈالتے تو میں یقیناً انھیں سپاہیوں سے انگریزوں کے کثیر التعداد لشکر کو پسپا کر دیتا۔ تاہم اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ہندوستانی ریاستیں ہمارے ساتھ ہیں۔ والیان ریاست اگرچہ خاموش نظر آتے ہیں لیکن ان کے قلوب حضور کی مٹھی میں ہیں اگر حضور نے کسی محفوظ مقام پر قلعہ بند ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تو سارا ہندوستان آپ کی پشت پر ہوگا۔

قلعۂ معلّیٰ کو آخری سلام

مثل مشہور ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے اِس عالم یاس و ناامیدی میں بادشاہ بخت خاں کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور بخت خاں سے فرمایا کہ ہم ہمایوں کے مقبرے جاتے ہیں۔ تم کل صبح وہاں آکر ہم سے اس وقت سوچ سمجھ کر گفتگو کرنا۔ تب مناسب جواب دیا جائے گا۔

ادھر بخت خاں کے ارادے تھے۔ اور ادھر مرزا الٰہی بخش اس خدمت پر مامور تھا کہ بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ ہرگز نہ جانے دے۔ بخت خاں کے جاتے ہی مرزا الٰہی بخش بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت کچھ سمجھا بجھا کر وعدہ کیا کہ میں انگریزوں سے مل کر تمام مُعاملات کی صفائی کرا دوں گا۔ بشرطیکہ آپ باغیوں کے ساتھ نہ جائیں۔

بیم و رجا کے اِس عالم میں بادشاہ کے لئے کوئی صحیح فیصلہ کرنا دشوار تھا آخر صبح سے پہلے بیگمات اور بچوں کو ساتھ لے کر لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرہ کی طرف کوچ کیا۔ آہ وہ کس قدر حسرت ناک منظر تھا کہ سلطنت مُغلیہ کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اپنے آباؤ اجداد کی عالیشان عمارت قلعہ معلی سے بے یار و

مددگار رخصت ہو رہا ہے وہ قلعۂ معلّیٰ جس میں بیٹھ کر شاہجہاں اور اورنگ زیب جیسے ہندوستان پر حکومت کرتے تھے۔ وہی لال قلعہ جس میں خاندان تیموریہ کے چشم و چراغ پلے تھے۔ جس میں بہادر شاہ ظفر نے سلطنت مغلیہ کی آخری آن کو برقرار رکھا تھا۔ وہی لال قلعہ جس میں شاہ ظفر مرزا غالب اور ذوق کو انعاماتِ شاہی سے مالا مال کیا کرتے تھے۔ وہی لال قلعہ جس میں بڑھاپے کے عالم میں شاہ ظفر نے دو جوان بیٹوں کی موت کے داغ سہے تھے۔ بادشاہ باچشم نم قلعہ معلیٰ کے در و دیوار کو الوداعی سلام کر کے بیگمات اور بچوں سمیت رخصت ہوتا ہے۔

بہادر شاہ درگاہ حضرت نظام الدینؒ میں

بادشاہ نے بال بچوں کو مقبرہ ہمایوں کی جانب روانہ کیا اور خود درگاہ حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین میں حاضر ہوئے۔ حسرت و یاس کے تاریک بادل چھا رہے تھے۔ خوف و ہراس کا عالم طاری تھا۔ اس وقت بادشاہ کے ہمراہ چند خواجہ سراؤں اور ہوادار کے سوا کوئی نہ تھا۔ ریش گرد آلود اور پراگندہ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں غم و الم کا ساگر موجیں مار رہا تھا۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کے نانا شاہ غلام حسن رحہ آستانہ درگاہ کے سجادہ نشین تھے بادشاہ کی تشریف آوری کی اطلاع پا کر حاضر خدمت ہوئے۔ بادشاہ نے انھیں مصائب اور ناکامی کی روئیداد سنائی۔ خواجہ صاحب موصوف کی روایت کے مطابق بہادر شاہ ظفر نے اس موقع پیران کے سامنے حسب ذیل تقریر

فرمائی تھی جس کا ایک ایک لفظ حسرت و یاس کا آئینہ دار ہے ۔

> بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں ۔ لیکن اس خون کی یادگار ہوں جس میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت باقی رہتی ہے ۔ میرے بزرگوں پر اس سے زیادہ آڑے وقت پڑے ہیں لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری ۔ مجھے تو غیب سے انجام دکھائی دے گیا ہے اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تخت ہند پر تیمور کی آخری نشانی ہوں حکومت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور کوئی دم میں بجھا چاہتا ہے پھر میں جان بوجھ کر کیوں مزید خونریزی کراؤں اس وجہ سے لال قلعہ چھوڑ کر چلا آیا ۔ ملک خدا کا ہے جس کو چاہے دے سینکڑوں برس ہماری نسل نے سرزمین ہند پر بادشاہی کی ۔ اب دوسروں کا وقت ہے یہ کوئی رنج اور افسوس کی بات نہیں ۔ آخر ہم نے بھی تو دوسروں کو مٹا کر اپنا گھر بسایا تھا‘‘

اس کے بعد بادشاہ نے شاہ غلام حسین کو ایک صندوقچہ دیا ۔ اور فرمایا یہ تمہارے سپرد ہے ۔ امیر تیمور نے جب ترکوں کو شکست دی تھی تو سلطان بایزید یلدرم کے خزانے سے یہ گرانمایہ چیز ہاتھ لگی تھی ۔ اس میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے پانچ بال ہیں ۔ جو آج تک ہمارے خاندان میں تبرک کے طور پر چلے آتے ہیں ۔ اب میرے لئے زمین و آسمان میں کہیں ٹھکانا

نہیں۔ ان کو لے کر کہاں جاؤں۔ تم سے بڑھ کر اس امانت کا کوئی اہل نہیں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا۔ یہ میرے دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں جن کو آج کے دن کی ہولناک مصیبت میں اپنے سے جدا کرتا ہوں۔" شاہ صاحب نے اس صندوقچہ کو درگاہ شریف کے توشہ خانے میں داخل کر دیا۔ جہاں وہ اب تک محفوظ ہے اور ہر سال ماہ ربیعؔ الاول میں ان تمام تبرکات کی زیارت ہوتی ہے۔

بادشاہ ہمایوں کے مقبرہ میں

کہتے ہیں بہادر شاہ اس وقت بھوک کی وجہ سے بیتاب تھے۔ کیونکہ عالم خوف وہراس میں تین چار وقت سے کسی کو کھانے پکانے کا ہوش نہ تھا۔ بادشاہ نے شاہ صاحب سے کچھ کھانے کے لئے فرمائش کی شاہ صاحب زندگی بھر کے لئے خدمت پر آمادہ ہوئے مگر شاہ ظفر نے یہ کہہ کر معذرت پیش کی۔ کہ آپ کا احسان ہے جو آپ ایسا کہتے ہیں۔ مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لئے اپنے بزرگوں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا۔ مجھے گوارا نہ ہوگا۔ زیارت کر چکا امانت سونپ دی۔ اب دو لقمے سلطان جی کے لنگر سے کھا لوں تو مقبرہ چلا جاؤں۔ وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہوگا۔ آخر کار شاہ صاحب گھر سے روٹی اور سرکے کی چٹنی لائے۔ بادشاہ نے کھا کر پانی پیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اور ہمایوں کے مقبرے کو چلے گئے۔

ہمایوں کے مقبرے میں بخت خاں اور مرزا الٰہی بخش کی شکل میں بادشاہ کے پیچھے ایک چھوڑ دو دو ملک الموت لگے ہوئے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے دفتر خبر رسانی

کے حاکم اعلیٰ میجر ہڈسن کو خفیہ طور پر لکھ دیا تھا کہ میں نے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روک لیا ہے۔ کل مقبرہ ہمایوں میں دوبارہ ملاقات کا موقع ہے جس وقت وہ رخصت ہوں آپ تھوڑی سی فوج لے کر آئیں اور بادشاہ کو گرفتار کر لیں۔

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری

جس وقت بادشاہ نے بخت خاں سے آخری ملاقات کی الٰہی بخش بھی آ گیا تھا۔ بخت خاں نے بہادر شاہ کو لے چلنے کے لئے اصرار کیا۔ الٰہی بخش نے مخالفت کی۔ آخر بادشاہ نے بخت خاں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔" بہادر! مجھے تیری بات کا یقین ہے مگر قوت جسمانی نے جواب دے دیا ہے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کر کے یہاں سے جاؤ۔ ہماری فکر نہ کرو۔ اپنا فرض انجام دو۔ آخر کار بغاوت کا بہادر علمبردار بخت خاں عالم مایوسی میں اپنی باقی ماندہ فوج لے کر مقبرہ کے شرقی دروازہ سے دریا کی جانب رخصت ہو گیا۔ اس کا اور اس کی فوج کا انجام کسی کو معلوم نہیں ہے۔ آج تک پتہ نہ چل سکا کہ بخت خاں کہاں گیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ بخت خاں بریلی کا رہنے والا تھا۔

باغی سردار کے رخصت ہونے کے بعد میجر ہڈسن نے اپنے جنرل سے بادشاہ کو گرفتار کرنے کی اجازت مانگی۔ اس موقع پر سوال پیدا کیا گیا۔ کہ بادشاہ کو زندہ گرفتار کیا جائے یا قتل کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ جنرل کی رائے قتل کے حق میں تھی۔ مگر دوسرے افسران کو اس سے اختلاف تھا۔ کیونکہ اس وقت صرف دہلی پر قبضہ ہوا تھا۔ اور تمام

مُلک میں بغاوت کی آگ کے شعلے اب تک مشتعل تھے۔ ایسی حالت میں بادشاہ کو زندہ گرفتار کرنا قرینِ مصلحت سمجھا گیا۔ میجر ہڈسن مقبرہ کے دروازے پر آیا۔ اور بادشاہ کو باہر طلب کیا۔ زینت محل کے کہنے سے بادشاہ نے بذریعہ پیام پہلے تین جانوں (شہزادہ جوان بخت، زینت محل اور اپنی اماں طلب کی میجر نے قبول کر لیا۔ اس کے بعد بادشاہ برآمد ہوئے پالکی لگائی گئی۔ دُنیا نے دیکھا کہ اکبر و شاہجہاں کے خاندان کا آخری تاجدار جہانگیر اور اورنگ زیب کا وارث مُلزم کی حیثیت سے پالکی میں سوار گوروں کے پہرے میں دہلی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

آتشِ انتقام

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد دِلّی کے اسٹیج پر انقلاب ۱۸۵۷ء کا پہلا ایکٹ ختم ہوتا ہے۔ اس انقلاب یا بغاوت کو ہم ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی منظم یا سوچی سمجھی جنگ نہ تھی۔ اس لئے ناکام ہوئی۔ پھر بھی سلطنتِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ آسانی کے ساتھ نہ بجھا۔ بھڑکتے بھڑکتے اور بجھتے بجھتے اپنی آخری لپک سے ہندوستان میں قیامت برپا کرتا گیا۔ بغاوت ہوئی خونریزی ہوئی۔ اور ایسی کہ دارالسلطنت اور دوسرے مقامات ہمارے خون سے رنگین نظر آئے۔ ادھر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے لال کنویں میں زینت محل کے مکان کے اندر قید کر دیا گیا۔ ادھر انگریزوں کی آتش انتقام بھڑکی۔ اس آگ سے تباہ کن شعلے بلند ہوئے اور انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں نے شاہجہاں آباد کی فضا میں ہلاکت اور

بربادی کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

اسی موقع پہ شمشیریں کیا کرتی ہیں کام اپنا
لیا کرتی ہے فاتح قوم آخر انتقام اپنا

انگریزوں نے بھی انتقام لیا۔ مگر حد سے متجاوز انتقام تاریخ بغاوت کے خونی باب میں انگریزوں کی پیشانی پر سے یہ داغ کبھی نہ مٹ سکے گا۔ انھوں نے ایک ایک کے سو سو بدلے لئے۔ اور بہت ہی بے تُکے بدلے جس میں ہزاروں بے گناہ ہلاکت و بربادی کی نظر ہو کر رہ گئے۔ دلی اجاڑ بنا دی گئی۔ اور ہماری تہذیب و تمدن کو پامال کر دیا گیا۔ گورے فاتحین کی نظر پہلے بہادر شاہ ظفر کے تین انقلابی شہزادوں مرزا مُغل۔ مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر اور ان کے ساتھیوں پر پڑی۔ یہ لوگ ہمایوں کے مقبرے میں پوشیدہ تھے۔ میجر ہڈسن اپنے سپہ سالار سے اجازت لے کر تین سو سپاہیوں کے ہمراہ ان کو گرفتار کرنے کے لئے روانہ ہوا لفٹینٹ میکڈاول کے قول کے مطابق ہمایوں کے مقبرے میں تین ہزار مسلمانوں کی جمعیت بھی موجود تھی۔ اور ان کے علاوہ قریب کی جھاڑیوں میں تین ہزار مسلح سپاہی بھی موجود تھے۔ مقبرہ پر دھاوا کرنا آسان نہ تھا۔ میجر ہڈسن اور لفٹنٹ میکڈاول نے حکمت عمل سے کام لیا۔ اور نصف میل کے فاصلہ پر ٹھہر کر شہزادوں کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ گرفتاری منظور کر لیں۔ یا مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں۔

تیموری شہزادوں کا دردناک قتل

غیور شہزادوں نے کہا کہ تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں مارتے ہیں یا مرتے ہیں۔ دارا شکوہ کو جب اورنگ زیب نے قتل کرنا چاہا۔ اور قاتل قید خانے میں آئے۔ تو دارا ترکاری چھیلنے کی چھُری لے کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر جلّادوں سے مقابلہ کرتا رہا۔ ہم کو بھی دلیرانہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ مرنا تو ہر حال میں ہے پھر بہادری کی موت کیوں نہ مریں!!

اگر مرزا الٰہی بخش شہزادوں کو دم دلاسے دیکر مقابلے سے دست بردار نہ کرا دیتا تو تاریخ انقلاب کا یہ حصہ کچھ مختلف ہوتا۔ شہزادے انگریزی سپاہیوں کا مقابلہ کرتے اور ہمایوں کے مقبرے اور نظامُ الدین میں ایک خونریز جنگ ہوتی۔ مرزا کے مشورے کے مطابق شہزادے بلا کسی شرط کے تن بہ تقدیر رتھوں پر سوار ہو کر میجر ہڈسن کے پاس چلے آئے۔ انگریزوں نے ان بدنصیب شہزادوں کی جانب خونخوار نگاہیں ڈالیں اور دہلی کی سمت کوچ کا حکم دیا۔

شہزادوں کے دل بیم و رجا کے عالم میں دھڑک رہے تھے۔ انھیں آنے والے خوفناک لمحوں کی خبر نہ تھی۔ وہ سوچ رہے تھے یا الٰہی نہ معلوم کونسا ماجرا پیش آئے۔ انگریز نہ جانے کیا سلوک کریں۔ کہ اتنے میں انھیں لباس اُتارنے کا حکم دیا گیا۔ یہ جگہ دلی سے ایک میل فاصلہ پر تھی۔ جہاں پر آج کل دہلی کی جیل واقع ہے۔ شہزادے حسرت آگیں نظروں سے میجر ہڈسن کی طرف دیکھنے لگے۔ انھیں خیال ہوا شاید

اس جگہ سے پا پیادہ قیدیوں کی شکل میں لے جانے کا ارادہ ہے۔ مگر آہ یہ جگہ تیموری شہزادوں کی قتل گاہ تھی۔ میجر ہڈسن نے غضبناک اور خونیں نظروں سے ان کی طرف گھورا۔ اور ان کے سر اور سینوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا مظلوم شہزادے ہائے کہہ کر گر پڑے تیموری شہزادے شاہجہاں کی خدمت میں فریاد لے کر عالم ارواح میں جا پہنچے۔ جب شہزادوں کی لاشیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ تو انگریزوں نے انھیں ایک شبانہ روز کوتوالی کے دروازے پر آویزاں رکھا۔

بادشاہ کا دِل گُداز ماتم

اس شامِ غم کی صبح کیسی المناک تھی۔ لال قلعہ کی شرقی دیواروں سے آفتاب نے سر نکالا آج اس کا لباس بھی خونی نظر آ رہا ہے عین اس وقت زینت محل کے محصور مکان میں بہادر شاہ کو دونوں لڑکوں اور تیسرے پوتے کی شہادت کی خبر ملی کلیجہ منہ کو آ رہا۔ بادشاہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ روتے روتے بیہوش ہو گیا۔ زینت محل نے سنبھالا۔ ایک ملازم نے پانی کے چھینٹے دیئے جب ہوش آیا تو بادشاہ پر دیوانگی طاری تھی۔ دردناک بین اور چیخوں سے گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ بدنصیب بادشاہ کے وہ دلگداز بین سُنئے۔ جو اس نے زینت محل کو مخاطب کر کے کہے تھے اور جنھیں مُصورِ غم علامہ راشد الخیری مرحوم نے "نوبت پنج روزہ" میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"اے بیگم! میرے چاند سے ٹکھڑے بے گور و کفن پڑے جنگل میں سو رہے ہیں اور کوئی خدا کا بندہ اتنا نہیں۔ کہ ان کا مُنہ دُھلا کر کپڑے بدل دے بالِشت بھر کے

لوتھڑوں کو ان ہاتھوں سے اسی دن کے لئے جوان کیا تھا۔ کہ ان کی موت پر کوئی آنسو تک گرانے والا نہ ہو۔ چیل کوّے ان کے پھول سے رُخساروں کو نوچیں کتے ان کو بھبھوڑیں اور میں سُنوں۔ اور زندہ رہوں۔ دیکھوں اور اُف نہ کر سکوں۔ آسمان ٹوٹ پڑتا اور زمین پھٹ جاتی۔ اس سے پہلے کہ چاند گہناتے۔ میرے پھول مُرجھاتے اور میرے بچے دُنیا سے رُخصت ہوتے۔ وہی دُنیا جو کل تک میری تھی اس وقت میری دشمن ہے جنھوں نے تمام عمر میرا نمک کھایا۔ آج انھوں نے ہی میرے لال پھانسی پر لٹکوا دیئے۔ زینت محل میں زندہ ہوں۔ اور میرے پیاروں کی لاشیں پھانسی پر لٹک رہی ہیں۔ میں موجود ہوں۔ اور میرے بچے گور و کفن کو محتاج جنگل میں پڑے ہوئے ہیں۔ بڑے دادا جان نے شاہجہاں آباد اسی دن کو آباد کیا تھا۔ کہ میری اولاد بھوکی پیاسی اس سرزمین پر دم توڑے۔ دُنیا ان کا تماشہ دیکھے اور ہنسے۔ زینت محل میرے پہلو میں دل ہے پتھر نہیں۔ بہادر شاہ انسان ہے جانور نہیں۔ مجھ کو سنبھالو، پکڑو۔ میرا دل نکلا میری جان چلی "اچھا اچھا پیارے بچّوں جاؤ بڈھا مظلوم باپ جس کی تقدیر میں تمہارا صدمہ دیکھنا لکھا تھا۔ مجبور ہے تم اس کے پاس سے بے آب، و دانہ تڑپ کر اور پھڑک کر سدھارتے ہو۔ لیکن وہ بے گناہ ہے۔ تمہاری پرورش میں اگر غلطی ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ اور خدا کے ہاں بے قصور باپ سے مواخذہ نہ کرنا"

آج روشن ضمیر مگر برگشتہ قسمت ظفر کی وہ پیشین گوئی ایک حد تک پوری ہو چکی تھی کہ "انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے" بیٹے انگریزوں کے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے تھے۔ ان کے سر قلعہ کے کنگرے پر نہیں تو کوتوالی کے دروازے پر لٹک رہے تھے خود بادشاہ زندہ تھا

مگر مردوں سے بدتر فلک کا ستایا ہوا۔ مریض غم۔ اور ہزاروں مصائب و آلام کا شکار ظفر
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

قتل و غارت کی گرم بازاری

شاہی خاندان کی تباہی اور بربادی کے بعد تاریخ غدر کی ٹریجڈی ختم نہیں ہو جاتی۔ قابو پاتے ہی انگریزی فوج نے دہلی میں قتل و خونریزی اور لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا کہ الامان الحفیظ۔ سینکڑوں خاندان تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ۔ ہزاروں بے گناہ موت کے گھاٹ اتر گئے دلی کو اجاڑ کر اس پر موت کی خاموشی طاری کر دی گئی۔ انگریزوں کے ہاتھوں دہلی پر ہلاکت و تباہی کی جو جو آفتیں نازل ہوئیں۔ اور ہندوستانیوں کے ساتھ جو خلاف انسانیت سلوک کیا گیا۔ بہتر ہے کہ اس کا نقشہ ہم انگریز مورخین اور آنکھوں سے دیکھنے والے مغربیوں کے اقوال سے ہی پیش کریں۔ انقلاب کے بعد دہلی میں قتل عام کی بابت انگریز مورخ اسپنسر والپول لکھتا ہے۔

"حتیٰ نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی۔ جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے مچا رکھی تھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے تھے اور پانچ پانچ چھ چھ سو آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی

والپول کا بیان ہے کہ تین ہزار مسلمانوں کو پھانسی دی گئی

مؤلف قیصر التواریخ نے لکھا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے۔

اور سترہ دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔"

تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیے

واقعات ۱۸۵۷ء کے متعلق بہت سے انگریز مورخین اور مضمون نگاروں نے کتابیں لکھیں اور ان کتابوں میں انھوں نے ہندوستانیوں کو وحشی اور انگریزوں کو مظلوم اور حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے تمام زیادتیاں باغیوں پر ختم کر دیں۔ اور دوسرے پہلو پر پردہ ڈال دیا۔ اکثر انگریز انشا پردازوں نے دل گداز داستانوں اور تاریخی ناولوں کی شکل میں۔ انگریزوں کی مظلومیت اور ہندوستانیوں کی وحشت و بربریت کی مفروضہ داستانیں پیش کر کے دل کھول کر اپنی فریب کارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ البتہ بعض منصف مزاج انگریز مورخین نے کسی قدر عدم تعصب سے کام لے کر دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان میں سے ایڈورڈ ٹامس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء پر ایک کتاب THE OTHER SIDE OF THE MEDAL یعنی تصویر کا دوسرا رُخ کے نام سے تحریر کی ہے اور کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ واقعات کو واقعات کے رنگ میں پیش کر کے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان منافرت دور کرنے کی کوشش کی

ایڈورڈ ٹامس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"انگریز مورخین نے اپنی قوم کی سیاہ کاریاں چھپانے میں تو پوری سرگرمی کا اظہار کیا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کی زیادتیوں کی خوب دل کھول کر تشہیر کی —

نہایت ضروری ہے کہ ہم اُن مستور اور پوشیدہ واقعات کے رُخ سے نقاب
یصلہ کن نظر ڈالیں تاکہ دُنیا کے سامنے اس واقعہ کا دُوسرا رُخ پیش کیا جا سکے
ہ کی اس آگ کا اندازہ کیا جا سکے جو اس وقت ہندوستانی سینوں میں ہمارے
ک رہی ہے ۔

جون ۵۷ء کو پشاور میں سرکاری حکم سے پھانسیاں دینے کا واقعہ ہی ایک
نامثال ہے جو دُنیا کے اطمینان کے لئے کافی ہوگی ۔ ایک سو بیس انسانوں
م مگر قبل از وقت بغاوت کے جُرم میں ماخوذ کیا گیا ۔

بُورڈ ٹامس کی مذکورہ کتاب کا ترجمہ احرار لیڈر شیخ حسام الدین صاحب
نے اُردو زبان میں پیش کر کے ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے اس سے
سرا رُخ واضح طور پر سامنے آجاتا ہے جس پر متعصب انگریز مورخین اور
وستانی مقلدین نے پردہ ڈال رکھا تھا ۔

قلاب میں انگریزوں کی جانب سے ہونے والے قتلِ عام کے سلسلہ میں ہم
س کی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ذیل میں چند اقتباسات پیش کرتے
، اندازہ ہو سکے گا ۔ کہ انقلاب ۵۷ء میں انگریزی فوج نے ہندوستانیوں
لمانوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا ۔

ارت گری کے لئے ایک انگریز کا بیان

ادغارت گری کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ایک انگریز افسر لکھتا ہے ۔

ہماری فوج کے شہر (دہلی) میں داخل ہوتے ہی وہ تمام لوگ جو شہر کی چار دیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں پر ختم کر دیئے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزین ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو کرم کے امیدوار تھے جن کے متعلق میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے انھیں اپنی سنگینوں سے وہیں ڈھیر کر دیا۔"

"بے گناہ شہریوں کو اس حال میں کہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اور عمر رسیدہ انسانوں کو اس حال میں کہ ان کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے۔ کاٹ کر رکھ دیا گیا۔"

عورتوں کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے

ایک موقع پر ٹائمس کا نامہ نگار لکھتا ہے۔

میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں سیر کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب ایک افسر شہر کے گشت کو جانے لگا۔ تو میں بھی ہمراہ ہو گیا ہم نے راستے میں چودہ عورتوں کی نعشیں شالوں میں لپٹی ہوئی بازار میں پڑی دیکھیں۔ جن کے سر دھڑوں سے

ان کے خاوندوں نے خود جُدا کر دیئے تھے۔ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور پذیر ہوا کہ خواتین کے خاوندوں کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر یہ انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ ان کی عصمت دری کریں گے اس لئے اپنے ناموس کے تحفظ کے لئے یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد انھوں نے خود بھی خودکشی کر لی چنانچہ ہم نے ان کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔"

"نادر شاہ کی تاریخی لوٹ، اور قتل عام کے بعد جبکہ اس نے چاندنی چوک کی مسجد میں بیٹھ کر غارت گری کا حکم دیا تھا۔ ایسا دردناک نظارہ آج سے پہلے شاہجہاں کے دارالخلافہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

ایک تاریخ کا مؤلف دہلی والوں کی خانماں بربادی کی تفصیل میں مندرجہ ذیل بیان کردہ حالات نقل کرتا ہے۔

> "باغیوں کے جرائم کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگانِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی ہزارہا مردوں عورتوں اور بچوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جس قدر مال و اسباب پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ ان سے ہمیشہ کے لئے انھیں ہاتھ دھونا پڑا۔ کیوں کہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کونے کو کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضہ میں کر لیا۔ اور باقی سامان کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا جس کو وہ اُٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔"
>
> عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے آپ کو ہمارے رحم پر چھوڑ دیا جن سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ کئی بار ایسی بے کس اور شریف عورتوں کے

غول کے غول قافلوں کی شکل میں دیکھنے میں آئے جن میں سے اکثر بیچاریاں بچوں کو اٹھا کر مشکل سے چل سکتی تھیں اور بعض کے ساتھ سن رسیدہ مرد نظر آتے تھے جو چلتے ہوئے ٹھوکریں کھا کر گر پڑتے تھے۔

"بلیک ہول" کا سا منظر

فریڈرک کوپر ڈپٹی کمشنر امرتسر بغاوت فرو کرنے کے لئے اپنے کارنامے بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

یکم اگست کو بقرعید کے تہوار کا دن تھا جسے مسلمان ہر سال جانوروں کی قربانی کر کے نہایت دھوم دھام سے منایا کرتے تھے اس لئے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لئے ایک مفید عذر تھا چنانچہ ان کو تہوار منانے کیلئے امرتسر بھیجدیا گیا اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کے لئے وہاں اکیلا رہ گیا جو مستاقانہ گھبرایا۔ بلکہ اس نے پورے حوصلے اور جرأت سے اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ تعفن سے وہاں کے رہنے والوں کی صحت خراب نہ ہو۔ لیکن قدرت نے پھر ہماری امداد کی یعنی اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا جس سے اس مشکل کا حل بھی نکل آیا۔ اور سینکڑوں مسلمانوں کی لاشیں کنویں میں پھینک دی گئیں۔

ان کے ساتھ اپنے بہیمانہ سلوک اور قتل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فریڈرک کوپر لکھتا ہے۔

"جب تقریباً ڈیڑھ سو مسلمانوں کو گولی سے اُڑا دیا گیا تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا۔ جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا سپاہی تھا۔ اسے آرام کرنے کے لئے تھوڑا وقفہ دیا گیا اس کے بعد قتل کی کارروائی کو دوبارہ شروع کیا گیا جب تعداد دو سو پنتیس تک پہونچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی۔ کہ باغی بُرج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں پر کہ وہ چند گھنٹے پہلے سے عارضی طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس پر بُرج کے دروازے کھولے گئے۔ تو معاً نہایت ہی دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس سے بلیک ہول BLACK HOLE کی تلخ یاد تازہ ہو جاتی ہے جو خوف گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہوئے تھے" ان میں زیادہ مسلمان ہی تھے۔

ہمہ گیر دیوانگی اور جذبۂ انتقام

جب میجر رینارڈ ہراول فوج کا ایک دستہ لے کر کانپور کے محصورین کی امداد کے لئے جا رہا تھا اس وقت اسے جنرل نیل کی طرف سے اودھ کے بعض دیہاتیوں کی عام تباہی کے لئے ہدایات موصول ہوئیں ان میں قصبہ فتحپور کے متعلق تحریر تھا کہ تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے کیونکہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ "تمام آبادی" میں ہزاروں بے گناہ مرد عورتیں اور بچے ہوں گے

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بغاوت کو فرو کرنے یا انتقامی کارروائی کرنے کے لئے بلا امتیاز بے گناہوں کو قتل کیا۔

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین (DE LEAN) نے جو آئرلینڈ کا باشندہ ہے۔ اپنے مقالہ میں لکھا تھا۔

> زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا۔ یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب اجازت نہیں دیتی — ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں ادا کرنا پڑے گا اس قسم کی دردناک سفاکی اور دنائی سزائیں دینے کا ہمیں مطلقاً کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

ان حالات کے سلسلہ میں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو قتل اور تاخت و تاراج کرنے میں سکھ فوجیوں نے بڑی دلچسپی سے حصہ لیا۔ بعض مغل سلاطین نے اپنے دور میں سرکشی اور بغاوت کے جرم میں سکھوں کی سرکوبی کی تھی اس سے بھی انکار نہیں کہ سکھوں کے ساتھ ظلم بھی ہوا تھا۔ لیکن تاریخ کی گذری ہوئی شخصی زیادتیوں کا عام مسلمانوں سے انتقام لینا مذموم اور کمینہ پرور ذہنیت کا مظاہرہ تھا۔ ایک عینی شاہد کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سکھوں اور انگریزوں نے

ایک مسلمان قیدی کے چہرے کو بار بار سنگینوں سے زخمی کر کے زندہ ہلکی آگ میں جلایا تھا بدنصیب قیدی کے جلتے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا ایک دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا کہ انسان نہایت وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے۔ یورپین اور سکھ نہایت متانت کے اور اطمینان سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر ارد گرد کھڑے دیکھ رہے تھے گویا کہ وہ ایک تفریح کا سامان تھا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خواہ بدقسمت قیدی کے مفروضہ جرائم کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں پھر بھی موجودہ سفاکانہ دردناک سزا کے بھگتنے کے بعد یقیناً اس نے اپنے گناہوں کی قرار واقعی پاداش اٹھائی ہے ٹائمز آف انڈیا کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل نے اس واقعہ کی ان الفاظ میں تصدیق کی کہ چند دنوں کے بعد میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اس میدان میں پڑا پایا۔

لارڈ کیننگ اپنے مراسلے میں جو ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا یورپین قوم کی طبائع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ہماری قوم کے دماغ میں ایک ہمہ گیر دیوانگی اور انتقام کا جذبہ موجزن ہے اس میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن سے بہتر طرزِ عمل کی توقع تھی ایسی پست ذہنیت کو دیکھ کر ناممکن ہے کہ ان کے ہم قوم ساتھیوں کی گردنیں ندامت اور شرمندگی سے نہ جھک جائیں کیونکہ ہر دس آدمیوں میں ایک بھی تو ایسا نہیں دکھائی دیتا جو چالیس یا پچاس انسانوں کے بیدریغ قتل و پھانسی کو ضروری

(۱) سراج الدین محمد بہادر شاہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار تھے لیکن انھوں نے دس مئی ۱۸۵۷ء اور یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان محمد بخت خاں صوبہ دار رجمنٹ توپ خانہ اور دوسرے افسران افواج انگریزی کو غدر اور بغاوت کی ترغیب دی اور غدر کرنے میں اعانت کی۔

(۲) بہادر شاہ نے اپنے بیٹے مرزا مُغل کو جو انگریزی کمپنی کی رعایا تھے اور دوسرے باشندگان کو جو انگریزی رعایا تھے۔ حکومت انگریزیہ کے خلاف ہتھیار اُٹھانے میں مدد دی۔ اور سازش میں شریک ہوئے۔

(۳) بہادر شاہ نے ۱۰ مئی سے یکم اکتوبر تک باوجود انگریزی رعایا ہونے کے خود کو بادشاہ ہند مشہور کیا۔ اور شہر دہلی پر ناجائز قبضہ کر لیا اور مرزا مُغل اور محمد بخت خاں سے سازش کر کے عَلم بغاوت بلند کیا۔ اور گورنمنٹ سے جنگ کے لئے آمادہ ہوئے۔ گورنمنٹ کا تختہ اُلٹ دینے کی غرض سے اسلحہ بند فوجوں کو دہلی میں جمع کیا اور ان کو جنگ پر آمادہ کیا۔

(۴) انتالیس نفر انگریزوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے قتل کرانے میں حصہ لیا اور دوسرے انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کرانے میں مدد دی اور والیان ریاست کے نام احکام جاری کئے کہ وہ عیسائیوں اور انگریزوں کو جہاں پائیں قتل کریں یہ سب بموجب قانون ۱۶ ۱۸۵۷ء سنگین جرائم ہیں۔

شاہ ظفر کا رقت انگیز بیان

۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو سہ شنبہ کے دن بہادر شاہ کو عدالت کے سامنے بحیثیت ملزم اس غرض سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جرائم کے متعلق بیان دیں۔ بہادر شاہ کی حالت قابلِ رحم تھی ضعیفی اور مصائب نے انھیں زندہ درگور کر دیا تھا جسم میں رعشہ اور ہاتھ پاؤں میں لرزش تھی۔ جو پہلے اپنے تھے وہ آج غیر بن کر عدالت میں ان کے خلاف شہادتیں دے رہے تھے جرائم کے ثبوت میں قسمیں کھا رہے تھے۔ شاید وہ اس الم نصیب انسانی ڈھانچے کو جس کا نام بہادر شاہ تھا۔ زندہ دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ آہ! دُنیا کی تاریخ کمال غم نصیبی، مظلومیت اور اس کے ساتھ کمال بے وفائی کی اس سے زیادہ عبرت ناک ٹریجڈی کبھی نہ پیش کر سکے گی۔ بدبختوں نے فنا ہونے والے دُنیاوی جاہ و مال کی خاطر انصاف کو کُند چھری سے ذبح کر دیا۔ اور ان کی پیشانی پر عرق انفعال کا ایک قطرہ بھی نمودار نہ ہوا۔ مظلوم شاہ ظفر کی آنکھیں اشک آلود تھیں اس نے گرد و پیش پر ایک حسرت ناک نظر ڈالی۔ اور عدالت کے سامنے رقت انگیز بیان دیا شاہ ظفر کا یہ بیان ـــ راشد الخیری مرحوم نے

"نوبت پنج روزہ" میں درج کیا ہے جسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

"یہ لوگ جو اس وقت میری جان کے درپے ہیں کبھی مجھ پر جان چھڑکتے تھے جنھوں نے عمر بھر میری جان کی قسمیں کھائیں۔ آج میری موت کا فتویٰ دے رہے ہیں جن کی زبانیں میری درازیٔ عمر کی دعائیں دیتی تھیں آج ان کے عمل اس وقت میری بربادی کے طلب گار ہیں مجھ پر جو الزام عائد کئے گئے ہیں ان کا کیا جواب دُوں آج میرا کوئی گواہ یا حمایتی نہیں۔ دُنیا جو کچھ کہہ رہی ہے صحیح ہے ان سب کے مقابلے میں ایک تنِ تنہا شخص کیا کہہ سکتا ہے اور کس طرح جُھٹلا سکتا ہے میں صرف اس قدر کہتا ہوں کہ بے گناہوں کا خدا شاہد ہے کہ یہ الزام سراسر غلط اور بہتان ہیں میں اپنا بیان پیش کرتا ہوں اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم کھا کر یہی کہتا ہوں کہ الزام غلط شہادت جھوٹی۔ اور میں بے گناہ ہوں غدر سے پہلے میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا صبح آٹھ بجے ہوں گے۔ کہ جمنا کی طرف سے غل غپاڑے کی آواز میرے کان میں پہنچی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ باغی میرٹھ میں قتل و خونریزی کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ میں نے فوراً حکم دیا کہ قلعہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں میں نہیں جانتا کہ اور کیا کر سکتا تھا۔ قلعہ دار نے مجھ سے خواہش کی کہ دروازے کھلوا دوں اور وہ باغیوں سے جا کر گفتگو کرے میں نے اس کو مناسب نہ سمجھا اور اس وقت میری جو کیفیت تھی بیان نہیں کر سکتا فریزر صاحب

اور قلعہ دار کے پیام میرے پاس آئے کہ دو توپیں اور دو پالکیاں بھیجدو، پالکیاں قلعہ دار نے اس لئے منگوائی تھیں کہ اس کے یہاں دو میمیں مہمان تھیں میں نے پالکیاں فوراً بھیجیں توپوں کا حکم دیا مگر پالکیاں راستہ میں تھیں۔ کہ فریزر صاحب قلعہ دار اور مہمان سب مارے گئے۔ اس تشویش میں تھا کہ باغی قلعہ میں گھس آئے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر پہرے لگادیئے اور کہا "جان کی خیر چاہتے ہو تو چپکے بیٹھے رہو۔ میں ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ اور فوراً زنانے میں چلا گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے یہ ظالم چند انگریزوں مردوں اور عورتوں کو گرفتار کرکے لائے۔ اور ان کو قتل کرنا چاہا۔ ان بے گناہ قیدیوں کی صورت دیکھکر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے ظالموں کی منت کی کہ رحم کرو اور قتل سے باز آجاؤ مگر ان کے دل نہ پسیجے ہاں میری گریہ وزاری پر اس دفعہ خاموش ہوگئے۔ انھوں نے تین بار یہی کہا میں نے ہر مرتبہ ان سے التجا کی۔ آخری مرتبہ اس خونخوار گروہ نے مجھ کو جھڑک کر ان کو قتل کردیا۔ ممکن ہے میرے سپاہی باغیوں کے ساتھ شریک ہوں اور انھوں نے بھی اس ظلم میں حصہ لیا ہو۔ مگر جاننا دکلا میری اجازت و تحریک سے ہرگز نہیں۔ اپنی خوشی سے کیا۔ یہ جرم کہ قلعہ دار اور فریزر صاحب میرے حکم سے قتل ہوئے قطعاً غلط ہے میرے پاس اس کے سوا کوئی ثبوت نہیں کہ میں اپنے خدا کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ مجھ کو اس کا

علم نہ تھا۔ گواہوں کا یہ بیان کہ میں نے حکم دیا صریح الزام و بہتان ہے اور مجھ بے گناہ پر سخت ظلم اور ناانصافی ہے اب رہے باقی معاملات میری مہر اور احکام کے متعلق ان کی کیفیت یہ ہے کہ باغیوں نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا تھا۔ اور میری آڑ میں جو چاہتے تھے کرتے تھے میرے منشی سے لکھواتے مہر لگواتے اور مجھ سے دستخط کرواتے۔ کیا عقل سلیم گوارا کر سکتی ہے۔ کہ اگر میں ذرہ بھر بھی اختیار رکھتا تو کیا یہ الفاظ سن سکتا تھا کہ ہم زینت محل کو چھین لیں گے۔ اور مار ڈالیں گے۔ یا میرے بیوی بچے ایسے گئے گذرے تھے۔ کہ باغی ان پر قبضہ کریں اور میں اف نہ کر سکوں۔ انھوں نے میرے خسر یعنی زینت محل کے باپ شمشیر الدولہ کو قید کیا اور میں ہوں نہ کر سکا مجھ سے یہاں تک کہا کہ میں اپنی زینت محل کو ان کے حوالے کر دوں۔ اور میں خون کے سے گھونٹ پی کر چپ ہو گیا۔ میری شرم و حیا غیرت و حمیت کیا اسی کی متقاضی تھی کہ میں ان کے احکام سنوں اور صبر کروں میں مجبور تھا لاچار تھا اور کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتی تھی۔ ظالموں نے جو چاہا وہ کیا اور جو چاہتے تھے وہ کرتے تھے میں بے بس تھا بے کس تھا میرے عزیز میرے نوکر سب ان سے مل گئے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ہی لوگ جو کل تک میرا کلمہ پڑھتے تھے جن کا منہ حضور حضور کہتے خشک ہوتا تھا آج میرے قتل و تباہی کے در پے ہیں اور میرے خلاف شہادت دے رہے ہیں

ہیں میں نے پختہ ارادہ کیا کہ ہجرت کر جاؤں اور دلّی چھوڑ کر مدینہ شریف میں اپنی زندگی کے دن پورے کروں۔ مجھ جیسا بدنصیب شخص جس کی زندگی مصائب کا انبار ہو اس کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ مگر یہ قصد بھی پورا نہ ہو سکا۔ اور ان لوگوں نے مجھے اُٹھنے نہ دیا۔ اور آج کے دن کو زندہ رکھا۔ میں نے یہاں تک کوشش کی۔ کہ قلعۂ معلّٰی کو خیرباد کہوں اور قطب کی درگاہ میں جا پڑوں رنگین کپڑے پہنوں اور دُنیا سے قطع تعلق کر لوں اور وہاں سے اجمیر چلا جاؤں اور کچھ دن درگاہ میں رہ کر مکہ معظمہ کا رُخ کروں مگر یہ بھی نہ ہُوا جن لوگوں نے خزانہ لوٹا، جو کہنے کو میرے سپاہی اور اصل میں بادشاہی کر رہے تھے وہ آقا تھے میں ان کا غلام انھوں نے زینت محل کے مکان پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے لئے جتّھہ دوڑے تقدیر اچھی تھی دروازہ نہ ٹوٹا ورنہ انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ کیا اس پر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ میرے دوست تھے اور جو کچھ کر رہے تھے میرے اشارے سے! اگر یہ میرے تھے تو کیا اس لئے کہ مجھ سے کہیں "اپنی بیوی ہمارے حوالے کر دو"! وقت نے جو کچھ سنوایا میں نے سُنا اور تقدیر جو کچھ دکھا رہی ہے دیکھ رہا ہوں! حبشی قنبر نے مجھ سے حج کی رخصت طلب کی اور میں نے دی مجھے کیا خبر کہ وہ ایران جا رہا ہے مجھ سے ایران سے کیا واسطہ یہ سب باغیوں کے کرتوت ہیں انھوں نے مجھے اتنا ذلیل کیا اور اس قدر حقیر اور

اس حد تک مجبور سمجھ رکھا ہے کہ میرے دیوان خاص بلکہ تسبیح خانہ تک جُوتیاں پہن کر پھرتے تھے۔ کیا میرے فرماں روا اور ان کے محکوم ہونے کا یہی ثبوت ہے ایک میں اکیلا ایک طرف تھا۔ اور یہ ساری دُنیا ایک طرف! میں جانتا تھا اور علی الاعلان ان سے کہتا تھا۔ کہ بندر کی بَلا طویلے کے سر نزلہ میرے اُوپر گرے گا۔ میرے پاس فوج نہ فرآرُو پیہ نہ پیسہ ان کو ضرورت کیا تھی کہ میری سُنتے جس رات کہ یہ شورش برپا ہوئی۔ اور باغی قلعہ میں پہنچے میں نے اسی وقت ایک سانڈنی سوار لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں بھیجدیا۔ میں بھاگا ضرور مگر جان کے خوف سے جب میں نے حُکاّم کے تیور بگڑے دیکھے تو ہمایوں کے مقبرے میں چلا گیا باغیوں نے کہا ہر چند کہ ہمارے ساتھ چلو مگر میں جانتا تھا کہ اور مٹی پلید ہوگی۔

میں وہ شخص ہوں جس کی بدنصیبی پر تقدیر بھی رونے کا حق رکھتی ہے اس لئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان سے نہ گذرا! جوانی اور بڑھاپا دونوں دُکھ بیٹتے پیٹتے اور رنج سہتے سہتے بسر ہوئے جن آنکھوں کی گردش دُنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو خُشک ہوگئے۔ جو ہاتھ امور سلطنت کو ایک اشارہ میں زیر و زبر کر دیتے اُنھوں نے جوان جوان بیٹوں کے جنازے ڈھوئے مگر اب سکت باقی نہ رہی خاندان شاہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوئی مجھ پر اور میرے بچوں پر کڑاکے کے فاقے

گذرے کلیجے کے ٹکڑے میرے سامنے خون میں نہائے اگر اس کے بعد بھی میں کسی سزا کا مستحق ہوں تو خدا کی مرضی مقدم ہے میں اس کے واسطے تیار ہوں تم سب مجھ کو ضرور سزا دو جب میرے دادا اکبر اور جہانگیر کی سلطنت باقی نہ رہی تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔"

بہادر شاہ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے عدالت اور حاضرین میں ایک سنّاٹا سا طاری تھا۔ مگر عدالت کا فیصلہ پہلے سے طے شُدہ تھا۔ بادشاہ کو مجرم قرار دیکر جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا گیا۔

بہادر شاہ کی رنگون کو جلاوطنی

بہادر شاہ ظفر کو فوجی پہرہ میں ہندوستان سے رُخصت کیا گیا بادشاہ کے ہمراہ ان کی بیگم زینت محل اور شہزادہ جوان بخت کے علاوہ چودہ مرد عورت تھے ان ان قیدیوں کا قافلہ گرانڈ ٹرنک روڈ سے (جو شیر شاہ سُوری کی بنوائی ہوئی سڑک ہے) گذرا کانپور سے گذرتے وقت لوگوں نے دیکھا کہ بہادر شاہ ظفر گیروا لباس پہنے فینس میں سوار تھے پچیس گورے ان کی فینس کے ارد گرد تھے۔ دو پالکیاں ہمراہ تھیں۔ جن میں زینت محل اور تاج محل وغیرہ بیگمات تھیں۔ دو تین گاڑیوں پر شہزادہ جوان بخت اور دوسرے لوگ تھے ان سب کے خرچ کے لئے آٹھ رُوپے یومیہ مقرر تھے۔ اس حال سے اکبر و شاہجہاں کے وارث ۱۸۵۸ء کے اختتام تک ساحلِ رنگون پر اُترے۔

جہاز سے اُتار کر بہادر شاہ کو رنگون کے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں قید کیا جہاں اُنھوں نے اپنے مُختصر خاندان کے ساتھ حراست میں غربت و افلاس کی زندگی پُوری کی۔ اخراجات کے لئے ایک معمولی رقم مُقرر کی گئی۔

آخری ایّام اور سفرِ آخرت

اس قید خانے کے اندر بہادر شاہ انتظارِ مرگ میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ آخرکار، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو نواسی برس کی عمر میں قیدِ فرنگ، بندِ غم اور قیدِ حیات۔ سب سے نجات پا کر اس جہانِ فانی سے سفرِ آخرت کر گئے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بہادر شاہ کو اس بنگلہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

شہزادہ جواں بخت نے غربت و بے کسی کے عالم میں بمقام مولمین (برہما) ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا۔ اس کی قبر کا کوئی پتہ نشان نہیں ہے۔

شاہ ظفر کی عمر بھر کی شریکِ غم و الم زینت محل بیگم تمام حوادثِ زندگی کا کفارہ ادا کرنے کے بعد، ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو اس دُنیا سے رُخصت ہو گئیں۔ اور پُرانے بنگلے کے احاطہ میں غم نصیب مرحُوم شوہر کے کچے مزار کے متصل دفن کی گئیں۔ بعد کو یہ بنگلہ ایک یورپین کمپنی کو دیدیا گیا۔ ان دنوں بعض لوگوں کے دل میں بہادر شاہ ظفر کے مزار کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں تحریک شروع

کردی گئی۔ اور رنگون کے چند سربرآوردہ اصحاب کے ایک وفد نے دورہ کیا۔ اور کچھ روپیہ جمع کر کے سلطنت مُغلیہ کے آخری تاجدار اور اس کی بیگم کی قبروں کو پختہ بنا کر ایک نشان بنا دیا۔ جہاں ہر وقت حسرت ہی حسرت برستی ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی شاعری

بہادر شاہ ظفر کو شاعری کا ذوق ہمیشہ سے رہا۔ یہاں تک کے آخری ایام میں قیام رنگون کے زمانے میں بھی انھوں نے اشعار کے ذریعہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا۔ بہادر شاہ کی زندگی ایک داستان الم تھی۔ اور ان کی زندگی کے آخری دور میں تو آلام و مصائب کے اتنے پہاڑ ٹوٹے جن کا کوئی شمار نہیں۔ رنگون میں، قید خانے کی چہار دیواری کے اندر شاہ ظفر نے بعض دردناک نظمیں کہیں جو رنگون سے کسی طرح دِلّی پہونچیں۔ اور دِلّی کی گلیوں میں بچے بچے کی زبان سے سُنی گئیں۔ کچھ محفوظ چیزیں عرصہ تک بعض لوگوں کی وساطت سے شائع ہوتی رہیں۔

قلعہ معلّی کے اچھے دنوں کی شاعری کے سوا شاہ ظفر کے دورِ مصائب کا کلام جذبات درد و الم کا آئینہ ہے اور براہ راست دل سے نکلی ہوئی آواز ہے دِلّی کی صاف سادہ اور ٹکسالی زبان میں طویل بحروں کے اندر روانی کے ساتھ حالِ دل بیان کر جانا صرف ظفر کا حصہ تھا پڑھ کر اندازہ کیجئے۔

ذیل کے اشعار ان کے قید رنگون کی یادگار ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں
مرا رنگ رُوپ بگڑ گیا۔ مرا حُسن مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھُول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں تو بے کسی کا مزار ہوں

جب بہادر شاہ ظفر زینت محل کی حویلی میں قید تھے اُس وقت کے دور مصائب کی یادگار ایک نظم بہت مشہور رہی ہے اس میں کہیں کہیں الفاظ کی مناسب نشست اور روانی کی کمی ہے۔ اس لئے بعض اسے کسی اور کا کلام بتلاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نئی مصیبتوں اور پریشانیوں کے عالم میں بے ساختہ جو کچھ زبان پر آیا وہ محفوظ کر لیا گیا اندازہ بتلاتا ہے کہ یہ سوائے ظفر کے کسی کا کلام نہیں ہو سکتا۔

نالۂ ظفر

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیا کہ ان پر جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گناہ
وے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے غبار ہے
نہ تھا شہر دلی یہ تھا چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی وہ خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تلیں کہو خارِ غم کو وہ کیا سہیں
ملے طوق قید میں جب انھیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
یہ وبال تن پہ ہے سر میرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم جو نکلے یہ دم میرا مجھے اپنی زندگی بار ہے
نہ دبایا زیرِ زمیں انھیں، نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشان مزار ہے
تجھے اے ظفر بھلا کس کا ڈر تو خدا کے فضل پہ کر نظر!
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامیِ کار ہے

۱۲۳۶۶

ظفر کے عہد مسرت کا رنگین کلام ملاحظہ فرمائیے ۔

وہ ہم سے وعدہ کر جاتے ہیں اکثر شب کے آنے کا
مگر آتے نہیں ہرگز کہ جا کر بھول جاتے ہیں
گذر جاتی ہے ساری رات کہتے کہتے یہ ہم کو
اب آتے ہیں، اب آتے ہیں اب آتے ہیں اب آتے ہیں

کدورت دل میں ہے ظاہر صفائی گر ہوئی تو کیا
ملاپ اُن سے ہوا تو کیا جُدائی گر ہوئی تو کیا

ہم اپنی جان تک ہیں اس بُت خود کام پر دیتے
نہیں کوڑی تک بھی یہ زاہد خُدا کے نام پر دیتے

اگرچہ خاکساری کیمیا کا سہل نسخہ ہے
ولیکن ہاتھ آیا جس کے دشواری سے ہاتھ آیا

فارسی کلام ملاحظہ ہو :-

سالہا گردیدہ ام من در تلاش کیمیا   دیدہ ام اکسیر گر آں خاک پارہ دیدہ ام
چُوں تو در عالم ندیدم مے کشتے صُوفی ملے   اے ظفر بسیار رند و پارسا را دیدہ ام

آخری دُعا

اورنگ زیب کے بعد مُغلوں کی سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی ایک عالی شان حکومت کی روشن قندیل اپنی روشنی کم کرتے کرتے ایک ٹمٹماتا ہوا دیا رہ گئی اس دیئے کو بُجھنا ہی تھا۔ آخر بُجھ گیا۔ بہادر شاہ کی شاہی اور جہاں پناہی کی حقیقت جو تھی وہ ظاہر ہے۔ اس جانِ زار کی بے پناہ الم نصیبی اور انتہائے مظلومیّت سے بھی کون انکار کر سکتا ہے جو کچھ گذرنا تھا گذر گیا۔ ظفر ایک حسّاس اِنسان، خُوش کلام شاعر اور صاحبِ دِل فقیر تھا اس کی زندگی ایک عبرتناک ٹریجڈی تھی۔

اس کتاب کو ختم کرتے ہُوئے بہادر شاہ ظفر کو دُعائے مغفرت کے ساتھ ایک بار پھر یاد کر لیں۔ خُدا اس کی رُوح کو مسرت بخشے اور اس کے مزار پر خُوش رنگ پھول کھلائے

آمین

عبداللہ فاروقی!

افسانۂ غم کا پہلا حصہ
ختم ہوا

اس پہلے حصے میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے یا غدر سے پہلے کے حالات اور بہادر شاہ ظفر کے دردناک مصائب درج ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حصے میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری مرحوم کی لکھی ہوئی تین شہزادیوں کی بپتائیں پڑھیے جو غدر ۵۷ء ہی سے متعلق ہیں۔

عبداللہ فاروقی

افسانۂ غم کا دوسرا حصّہ

بیلے میں میلہ

یا

غدر کی ماری شہزادیاں

مُصنّفہ

مُصوّرِ غم علّامہ راشدُ الخیری دہلوی مرحُوم

غدر کی ماری شہزادیاں

کل رات کو جب حسینۂ ارضی چادرِ مہتاب میں لپٹی بے خبر سوتی تھی دل وحشی رنگ لایا چاند کی روشن شعاعیں تیر کی طرح آنکھوں میں گھسیں۔ دماغ نے راحت و سکون کے بجائے یادِ رفتگان پر رجوع کیا، اور آنکھیں زندہ دنیا میں بچھڑی ہوئی صورتوں کو تلاش کرنے لگیں تارے آدھی رات کا نقارہ بجا چکے تھے آہستہ سے اٹھا اور خاموشی سے چلا اور ایک بجے کے قریب اس جسمِ خاکی کو شاہ ولی اللہ کے قبرستان میں لے گیا۔ اس قبرستان کو "مہندیاں" کہتے ہیں۔

دل رو رہا تھا مگر آنکھ خاموش تھی کائنات سو رہی تھی لیکن چاند مصروفِ کار تھا، مہندیوں کا وسیع میدان، جہاں کوسوں زندہ انسانوں کا نشان نہیں، دلّی کا مشہور قبرستان ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز رح کا مقدس خاندان اسی سرزمین میں محوِ خواب ہے۔ راستہ آتشِ ماہ سے دہک رہا تھا اور خوابگاہ نیم کی خوشبو سے

طرھتی۔ درگاہ میں داخل ہوا تو شکستہ آثار اور کالی کلوٹی دیواریں مسلمانوں کے
نفسیر کر رہی تھیں ایک خاندان کے ان سات بزرگوں کی یادگار مولانا
رح۔ مولانا شاہ عبدالقادر رح۔ مولانا شاہ عبدالرحیم مولانا شاہ
۔ مولانا شاہ رفیع الدین رح۔ مولانا شاہ محمد اسحٰق رح اور محترم ماں جس
ے یہ لال پیدا ہوئے : آج پردہ دنیا پر یگانہ روزگار ہے۔ سات
آسمانی گچھا ہرات ان کے مقدس نام چومتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور
رں کو گنوا کر ان پھولوں کو جو تناور درختوں کی سرسبز پتیوں سے ان
دل پر چڑھائے تھے ہوا صاف کر رہی تھی۔

لی کا رہنے والا ہوں جوانی کی سیاہی اسی سرزمین پر بڑھاپے کی
بدلی۔ بارہا جنازوں کے ساتھ بھی اور فاتحہ کی غرض سے بھی جانے کا
ے مگر آج تک اس چبوترے پر چڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی تاریخ
ب علوم کے ان تاجداروں اور مذہب اسلام کے ان خدمت
کومت اور سلطنت سامنے لاتی ہے تو جسم کانپ جاتا ہے اور اقلیم
شہنشاہوں کا جلال پاؤں میں زنجیریں بن کر پڑ جاتا ہے تو ٹھہرا جاتا
رسے اس جھنڈے کو سلام کرتا ہوا الٹے پاؤں واپس ہوتا ہوں
انھوں نے اسلام کی حمایت میں گاڑا جو آج بھی اتنا مستحکم و استوار
زمانہ کی زبردست سے زبردست آندھی اس کو جگہ سے نہیں

سے باہر نکلا تو کچی پکی قبریں ٹوٹی پھوٹی دیواریں، الٹے سیدھے

تعویز جو مسلمانوں کی حالت کا آئینہ تھے۔ ان کی صورتیں دیکھتا ہوا باہر نکل آیا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر کوٹلہ میں دم لیا۔ اور پھرتا پھراتا اس جگہ پہونچا جو بیلہ روڈ کہلاتی ہے "بیلہ روڈ" ترقی جہاں آباد کا ایک شعبہ ہے برقی روشنیاں جگمگا رہی تھیں سڑک موتی کی طرح صاف اور شفاف، دونوں طرف خوشنما کوٹھیوں کی قطار۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، ایک ہلکی سی آواز کسی چوکیدار یا برقنداز کی۔ "بیلہ روڈ" کا بورڈ پڑھتے ہی پرانی دلی یاد آگئی۔ اور بیلے کی اصل تصویر آنکھوں کے سامنے تھی۔ "بیلہ" سرکنڈوں کا ایک گھندار جنگل پچاس سال پہلے جمنا کے کنارے دور تک چلا گیا تھا۔ یہاں دلی والوں کی کبڈی اور آنکھ مچولی کے تماشے میری آنکھوں نے بھی دیکھے ہیں اور جو رنگ میں دیکھ چکا ہوں جہاں آباد ہزار بار اُجڑے اور بسے مگر وہ چیز ختم ہو چکی۔

دل بدبخت کی کیفیت الفاظ میں کیوں کر ادا کروں چاند آسمان کی گود میں اٹھکیلیاں کر رہا تھا اور تارے بساط فلک پر ابلے گیلے پھر رہے تھے۔ میں بھی وہی تھا اور آسمان بھی وہی لیکن ہائے زمین وہ نہ تھی۔ بیلا اُجڑ چکا تھا سرکنڈوں کی چھاؤں غارت، اور پرندوں کے آشیانے تباہ تاراج ہو چکے تھے آنکھوں نے نگبود کی طرف اس جمنا کو دیکھا جس کے پانی کو دنوں نہیں برسوں بوسے دیئے تھے۔ مگر آہ جمنا کہاں وہ نہروں میں تقسیم ہو کر ایک تالاب رہ گئی تھی۔ دل جس کو ڈھونڈھ رہا تھا اس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔

اس وقت پچاس برس پہلے کی ایک صحبت یاد آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا میں اور میرے پھوپی زاد بھائی مولوی اشرف حسین ایک شام کو مولوی

نذیر احمد مرحوم کے ہمراہ گاڑی میں جا رہے تھے منشی ذکاء اللہ مغفور بھی ساتھ تھے۔ موری دروازے کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا بھولو شاہ (بوعلی شاہ قلندر) کی بسنت ہے جمعرات کا دن تھا دلی نئی نئی تاراج ہوئی تھی۔ مگر دلی والے آٹھویں دن "پیر غیب" پر جمع ہو کر اجڑی ہوئی دلی کی فاتحہ پڑھ لیتے تھے ہم دونوں بھائی مولانا مرحوم کے شاگرد تھے گاڑی ایسی جگہ پہونچی جہاں دلی کا مشہور بین نواز رحمت اپنے فن کا کمال دکھا رہا تھا میں نے دیکھا کہ مولانا کی استادانہ حیثیت رحمت کے مقابلے میں مغلوب ہو رہی ہے جو کمزور ہوتے ہوتے اس حد تک پہونچی کہ استاد مرحوم نے گاڑی رکوا دی۔

دلی! اے دلی! تیری خاک سے کیسے کیسے باکمال پیدا ہوئے۔ اور تیرے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں فنون کے کیسے کیسے تاجدار دفن ہیں۔ جن کی روشنی ایک دنیا کو جگمگا گئی۔ کجا مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ اور کجا رحمت بین نواز مگر حق یہ ہے کہ کمال اتنا تو ہو۔ کہ کلیجہ توڑ دے دونوں بزرگ اتر پڑے یہ خبر نہیں کہ کیا دیا مگر نقد بھی دیا اور داد بھی دی۔

گاڑی عصر کے بعد گھر لوٹی اور ہم دونوں بھائی اپنے چند دوستوں کے ساتھ شاموں شام "پیر غیب" پہونچے۔

کیوں کر دکھاؤں کہ کیا دیکھا بیلے میں میلا اور جنگل میں منگل ہو رہا تھا آج جہاں بجلی کے خاموش قمقموں پر الو بول رہا ہو۔ جہاں دور تک دوکانوں کا تانتا تھا۔ تنبو تنے ہوئے ڈیرے پڑے ہوئے خیمے گڑے ہوئے۔ ہنڈولے لٹکے ہوئے تن زیب کے مہین مہین انگرکھے۔ کندھوں پر بسنتی دوشالے ہشاش

بشاش صورتیں سُرخ و سفید چہرے۔ جو تھا وہ ہنستا بولتا، اُچھلتا کودتا۔ مگن چلا جا رہا تھا۔

آج ان صورتوں کا خیال آتے ہی دل بیٹھ جاتا ہے سنا مکان، بے فکری کے دن من بھر کے گیہوں، چار پیسے سیر دودھ اور دودھ بھی کیسا؟ ملائی کے گھونٹ، دن بھر کا اونٹا ہوا دودھ، آدھ سیر میں آدھ پا سے زیادہ روئی کی روئی ملائی۔ دو گھونٹوں میں جی خوش ہو گیا۔ یہ تھیں وہ غذائیں جو آدمی کو آدمی بناتی تھیں۔ آج کے دلی والوں کو دیکھتا ہوں، سوکھے چھپیٹی دھان پان آنکھوں میں حلقے گلوں میں گڑھے۔ رزق کے مارے، خوراک کو محتاج، دودھ کو ترستے، گھی کو پھڑکتے۔ میں اس کو بسا غنیمت سمجھتا ہوں کہ شہر کے صاحب کمال اپنے ساتھ ہی اپنے قدردان بھی ختم کر گئے۔ اور آج کا بیان داستان شب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس وقت کا یہ ذکر ہے ان دنوں آدھی رات کے وقت شہر میں ایک صدا گونجتی تھی۔

”رشیدی کنور کے باغ کا دانہ“

یہ ایک خوش الحان کنجڑا تھا جو نو بجے رات کو ”رشیدی قنبر“ کے باغ سے کھجوروں کا چھپیا لے کر اُٹھتا تھا رات کے سناٹے میں جب اس کی آواز کھنبری کی طرح جھومتی تھی تو لوگ پروانوں کی طرح گرتے تھے۔ اسی طرح نوچندی جمعرات کو ”بڑیوں کا کڑہ“ میں عشاء کے وقت حسینا کی اس آواز میں ایک خاص امتیاز تھا۔

”لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی“

ہم آگے بڑھے تو شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی بی اے آنے ان سے باتیں ہو رہی تھیں کہ پُکاروں کی آواز کان میں آئی اور مرزا نے کہا۔

"شہزادی" گونج رہی ہے

اِدھر پہنچے تو بیگم ایک عجیب انداز سے پھول بیچ رہی تھی پٹا پٹی کے گُپّے۔ تُرپی ہُوئی لیکری کٹاؤ کی جھالریں چھیبوں پہ پڑی ہوئی توے کا حُقہ منہ سے لگا ہوا نیچے پھول مہک رہے ہیں۔ اور پنجرے میں اگن لہک رہا ہے! ادھر پھولوں کی خوشبو ہے اُدھر تمباکو کی۔ سامنے قلعی دار پاندان ہے۔ برابر میں کوری صراحی! الغرض نفاست اس کی حالت پر اور شرافت اس کی صورت پر قربان ہو رہی تھی۔ بڑھاپے کی حدود میں سُرخ و سپید رُخساروں کی جھُریاں با آواز بلند قصر شباب کی بہار سنا رہی تھیں میں بیگم کے نام سے تو واقف تھا مگر خبر نہ تھی۔ کہ بڑھیا گل فروش کے منہ سے بھی پھول جھڑتے ہیں۔ میر محفوظ علی جو ہمارے ساتھ تھے اور ہم میں شاید سب سے بڑے تھے ٹھٹک گئے اور کہنے لگے۔ بیگم آواز کا کڑاکا اب بھی غضب ڈھا رہا ہے"

بیگم کے خاموش چہرے پر مُسکراہٹ کھلنے لگی۔ اس نے مونڈھوں کو ٹھیک کیا اور کہا "آؤ سید بیٹھو" جب ہم بیٹھ گئے تو بیگم نے جواب دیا۔

"سید بادشاہ!" اب کڑاکا کہاں! جوانی اپنے ساتھ سارا کس بل لے گئی۔ رہا سہا غدر نے اچمود کر دیا۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں۔ بدن میں جان نہیں، داڑھیں نکل گئیں۔ دانت جھول آئے۔ بدن کا سُکھ جوانی نے توڑا ڈھانچ رہ گیا ہے چاروں طرف لئے پھرتی ہوں! پرسوں چچا کالے ملے تھے مرزا کا طنطنہ یاد ہے؟

مُحلّے والوں کی رُوح فنا ہوتی تھی۔ جدھر نکل گئے قیامت آگئی۔ تھانہ دار اور کوتوال تک پناہ مانگتے تھے۔ اب دیکھو کیا رنگ ہے کمر جھک گئی۔ طباق سا چہرہ سیپی اور چھاج سا سینہ تنکا رہ گیا وہ چونچالی اور خوشحالی سب ہوا ہوئی۔ جس نے نو من مگدر کی جوڑی پھول کی طرح اٹھالی۔ آج پانچ سیر وزن اُٹھانے میں ہانپ رہا ہے! بادشاہ یہ سب طاقت و جوانی کے کھیل ہیں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

"آج کہرام ہے یہ سامنے والا تنبو دیکھا؟ شہزادیوں کا ہے۔ بادشاہ کی بھتیجی گوہر آرا بیگم آئیں ہیں۔ اور سہیلیوں کو جمع کیا ہے سب اپنی اپنی غدر کی داستانیں سُنائیں گی۔ بڑی سرکار رابعہ بیگم، جہاں پناہ کی صاحبزادی بھی آئی ہیں اذنِ عام ہے جو چاہے شریک ہو۔"

گوہری تنبوُ

گوہری تنبو کے سامنے والا میدان آدمیوں سے پٹا پڑا ہے۔ بسنتی قمقمے ڈال ڈال اور پات پات جگمگا رہے ہیں؛ قندیلیں روشن ہیں۔ چراغ جل رہے ہیں۔ اور کافوری شمعیں ان حسرت نصیب گھڑیوں پر آنسو بہا رہی ہیں۔

گوہر آرا بیگم کی بچھڑی ہوئی سہیلیاں جو کبھی پھولوں میں تُلتی تھیں آج پیوندوں میں ڈھکی ہوئی ہیں۔ اس غرض سے جمع ہوئی ہیں کہ ان نیک بختوں پر فاتحہ پڑھیں جن کو وقت نے بھوکا پیاسا موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ جب شمع ان مہمان بیویوں کی ترسنی آنکھوں کو زندہ صُورتیں دکھا چکی اور ایثار مصائب کی

یاد نے جو قیامت برپا کی تھی وہ ختم ہوئی تو دل ان بچھڑوں کو ڈھونڈھنے لگا۔ جو جیتے جاگتے خاک و خون میں نہائے۔ آنکھیں دھاڑیں مار مار کر روتیں اور دماغوں نے نام لے لے کر پکارا۔ مگر زندگی کی گھڑیاں اس تماشے کو روندتی ہوئی آگے بڑھیں آنے والوں کی مسرت نے جانے والوں کی یاد دل سے بھلا دی فانوس بزم احباب کو منور کر رہے تھے محبت کا دور جاری تھا اور پھولوں کی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی تھی۔ کہ مہماں نواز خاتون نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

آج "بیلا" اور "بیلے کی مہمان" دونوں اجڑ چکے، شہزادیوں کی بزم اور اس کے دور ختم ہوئے اور رات فجر ہوئی۔ اور اس کے بعد لاتعداد راتیں سر پر آئیں اور گئیں۔ مگر اس رات کا سماں آج تک آنکھوں میں سمایا ہوا ہے اور اب موت کے سوا اس بیلے کو بھلانے والی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔

شاہجہاں آباد اگر تاراج نہ ہو چکا ہوتا تو "بیلے" کی یہ بات حق رکھتی تھی کہ اس کا ایک ایک لمحہ دلی والوں کے سر آنکھوں پر ہوتا۔ تاریخ اس قیامت خیز واقعات کی پرستش کرتی اور انسانیت کی آنکھیں ان مصیبت کے ماروں پر جن کی داستانوں سے سننے والوں کے کلیجے ہلا دیتے محبت کے آنسو گراتیں۔ مگر وقت نے شہر اور شہر کے ساتھ والوں کو اس طرح تباہ کیا تھا کہ عقل و ہوش سب رخصت ہو چکے تھے یہ بھی چند زندہ دلوں کا طفیل تھا کہ زندہ مُردہ دلوں کے دکھتے مٹی ہوئی زندگیوں کو تازہ کر رہے تھے میں نے بھولو شاہ کی اس بسنت میں جو صورتیں دیکھی تھیں اب ان میں سے ایک بھی نظر نہیں آتی۔ اور جو چہرے "گوہری تنبو" میں نظر آئے وہ سب رخصت ہو چکے اور ایک آدھ باقی بھی ہے تو مُردے سے

بدتر کھٹیا پر پڑا پیل رہا ہے۔

شہزادہ مرزا محمد اشرف گورمانی بی۔ اے جو اس صحبت میں ہمارے شریک تھے اور جنھوں نے یہ رات رو رو کر صبح کی تھی اگر زندہ ہوتے تو یقیناً شہزادیوں کا یہ نالہ جو "بیلے" کی سرزمین پر ہوا مرنے نہ پاتا۔ اور فضائے ادب میں ایسا گونجتا کہ سُننے والے بھی بلبلا جاتے لیکن بدبختوں کی تقدیر پر کوئی رونے والا بھی نہ تھا۔ اور لاتعداد راتوں کی طرح وہ رات بھی آئی گئی ہوئی جس نے خاندان تیموریہ کی لُٹی کٹی بیگمات کے آنسو اپنے آغوش میں لئے۔ "گوہری تنبو" خلیفہ اکن کے دنگل میں گاڑا گیا تھا چاروں طرف قناتیں کھڑی ہوئی تھیں اور رات کا ایک حصہ بجائے دیبا و حریر کے ان مخدرات کے نازک جسم کی پردہ پوشی کر رہا تھا جو قلعہ معلّٰی سے نکل کر اس وقت "بیلے" کی مہمان تھیں آسمان کے تارے ان کی تیرہ بختی کے شاہد تھے۔ اور زمین بتا رہی تھی کہ یہ شہر پر راج کرنے والیاں آج دو دو دانوں کو محتاج ہیں شہزادیوں میں پردہ برائے نام تھا اس لئے تنبو میں داخلہ کی عام اجازت تھی۔ جگہ چونکہ کافی اور میدان وسیع تھا۔ اس لئے چپقلش نہ تھی۔

گوہر آرا شکریہ ادا کر چکیں تو مہمانوں کے سامنے پانوں کی کشتی آئی۔ کاغذی حقے جو بادشاہ کے ساتھ ہی شہر سے کوچ کر گئے چاروں طرف سُلگ رہے تھے کہ ایک بیوی سنبھل کر بیٹھیں گوہر آرا نے فرمایا۔

یہ ظلِ سُلطانی کی خالہ زاد بہن مظفر بیگم ہیں۔ ان کی صورت اب پہچانی نہیں جاتی۔ مگر جنھوں نے قلعہ معلّٰی کی چہل پہل اور مظفر کی رنگ رلیاں دیکھی ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ غدر نے جن کو زندہ چھوڑا ہے ان کو ابھی اس طرح نچوڑا کہ حال سے بے حال

اور صورت سے بے صورت کر کے یہ انار سرخ و سپید دانہ آج پھیکا شلجم ہے حق یہ ہے کہ ہم کو اس صورت ہی کے لالے تھے! قربان جایئے اس خدا کے جس نے بچھڑی ہوئی مظفر کو ہم سے ملوا دیا اور یہ صورت پھر دکھا دی! مظفر پر شہر سے نکل کر کیا بیتی یہ خود سنائے گی مگر اتنا میں بھی جانتی ہوں کہ ہماری عیش کی گھڑیاں حضور کے دم تک تھیں ہمارا سہاگ بادشاہ کے ساتھ ختم ہوا جینا ہنسنا تھا سرکار کے ساتھ ہنس لئے اب روئیں گے اور اس وقت تک روئیں گے جب تک بدن میں سانس باقی ہے ۔

شہزادی مظفر سلطان بیگم کی سرگزشت

رات خاصی ڈیڑھ پہر کے قریب گزر چکی ہے اور گو تمام میلہ میں کچہریاں بک رہی تھیں مگر گوہری تنبو والوں کو سانپ سونگھ گیا تھا گویا نماز ہو رہی تھی کہ کھانسنے کھنسنے کے سوا کوئی آواز ہی نہ تھی۔ مظفر سلطان بیگم اب آگے کھسکیں اور چاروں طرف دیکھ کر کہا ---

ظلِ سلطانی جن کے سایہ میں ہمارا بچپن کٹا اور جوانی گزری۔ ہم سے ہزاروں کوس دور زندگی کے باقی دن پورے کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے۔ سرکار کے مبارک ہاتھوں کے نوالے میرے منہ میں گئے ہیں اور حضور نے سینکڑوں ہزاروں مرتبہ میرے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا ہے مگر یہ تقدیر کی خوبی ہے کہ عالیجاہ پر وقت پڑا اور دلی کی آواز کو ترس گئے تو ہم کسی خدمت کے قابل نہ رہے ۔

مظفر سلطان کے منہ سے سرکار کا نام سنتے ہی سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بادشاہ کی مغفرت کے لئے ہزاروں ہاتھ بلند ہو گئے ۔

جب یہ ہو چکا تو مظفر سلطان نے کہا ۔

شہر کی حالت اتنی ابتر ہو گئی تھی کہ ہر طرف کہرام مچ رہے تھے اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں سے رات بھر رونے پیٹنے کی آواز نہ آتی ہو۔ بھاگنے والے بھاگ چکے تھے ۔ اور اب بھی جس کا جدھر منہ اُٹھا جا رہا تھا۔ افراتفری ایسی تھی کہ بھائی کی بھائی کو خبر نہ تھی زندوں کی خیر صلاح تھی نہ مُردوں کی خبر۔ اپنوں کا ہوش نہ غیروں کا خیال ۔ مغرب کے بعد مُنشی وزیر مُخبر آ کر بتا دیتے تھے کہ کل اس کو پھانسی ہو گی۔ سنتا ہی سنت پر جان تھی ۔ ایک قدم اُٹھاؤ ۔ دوسرے کی خبر نہیں۔ بھاگنے کا رستہ تھا، نہ چھپنے کی جگہ دھڑکے میں جان اور کھٹکے میں دل، جو پکڑا گیا پھر پلٹ کر نہ آیا۔ میرے شوہر خسرو مرزا کو دن دھاڑے کوتوالی چبوترے پر کالے مخبر نے پھانسی دی۔ میں بہتیرا ہی تڑپی اور رو دی کہ صاحب عالم کی لاش اپنے ہاتھ سے دفن کر دوں مگر کسی نے نہ سنی۔ اور یہی کہا کہ جب بادشاہ کے لالوں کو کفن نصیب نہ ہوا تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ مرزا کے بعد جینے کا مزا نہ تھا اور مجھے سب سے بڑا کھٹکا سلیم کا تھا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں کہ دیکھئے اس کا کیا ہوتا ہے ۔ میں نے کالے اور اس کے بیوی بچوں کی رات رات بھر خدمت کی۔ کہ کہیں ظالم میرے بچے کا نام نہ لے دے اور مرزا کے ساتھ اس کا داغ بھی نہ اُٹھانا پڑے ۔ کالا اصل میں لوہار تھا ۔ مگر اس وقت شہر بھر کا مختار تھا۔ اس کی مُخبری پر چُٹکی بجاتے پھانسی ہوتی تھی۔ پُوچھ نہ گچھ مسل نہ مقدمہ جس دن بھائی فراست کو پھانسی ہوئی ہے وہ رات خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے ۔ وہ میرے واسطے

توقیامت سے کم نہ تھی۔ جب کالے نے کہا کہ تمہارے بچے کا نام بھی آیا ہے" میں ا سُن کر چکرا کر بیٹھ گئی۔ کالا میری حالت پر ہنسا اور کہا۔ شہر میں بارہ مخبر ہیں اس وقت تو میں نے بچا لیا مگر ان بے ایمانوں کے منہ کو خون لگا ہوا ہے اور مسجد میں قسم کھا کہ بے لئے اپنے باپ کو نہ چھوڑیں گے تمہارے پاس جو جمع جتھا ہو لے آؤ۔ میں دے کر پاپ کاٹوں۔ خبر نہیں دوڑ کس وقت آجائے۔

میرے پاس نقد تو ایک کوڑی نہ تھی۔ جو گہنا پاتا تھا وہ اُپلوں کی کوٹھ میں دبا رکھا تھا مجھے زیور بچے سے زیادہ نہ تھا۔ دوڑی دوڑی گئی اور جو کچھ تھ کھود کر اس کے حوالے کیا مگر دل کا یہ حال تھا کہ گزوں اچھل رہا تھا اور سب بڑا دھڑکا یہ تھا کہ تیزی کی بارہ چھوڑ ستائیس ہو گئی تھی۔ مگر مردوں کی سلامتی گھنگھنیاں اب تک نہ اُبلیں۔ کس کی نیند اور کس کی بھوک، آدھی رات اسی چکر بیت گئی۔ سچ تو ٹھیک یاد بھی نہیں کہ آدھی رات تھی یا پچھلا، میں نے سلیم او فرخ دونوں بچوں کو ساتھ لیا۔ سلیم ماشاء اللہ پندرھویں اور فرخ اللہ رکھے چھٹے بر میں تھی یہ دونوں نیند میں کسمساتے اُٹھے مگر ان کو لے کر کسی نہ کسی طرح دلی در تک پہنچی تو وہاں اور کالوں کی راؤٹیاں کھڑی ہوئی تھیں اور لالٹینوں میں او تلواریں اور کرچیں دُور سے جگ مگا رہی تھیں قدم بڑھانے کی ہمت نہ پڑی۔ ا دونوں بچوں کو کلیجہ سے لگا کر بیٹھ گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ پہرے والے نا بے خبر پڑے ہیں تو بچوں کے مُنہ میں آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونکی اور دبے پاؤں چور کی طرح آگے بڑھی کیا بتاؤں دل کا کیا حال تھا! سر پر موت تھی اور سامنے دمدم برقندازہ، مگر اللہ کی کچھ ایسی مہربانی ہوئی کہ میں پُرانے قلعہ تک پہنچ گئی۔ ا

سانس تک کی آواز میرے کان میں نہ آئی۔ یہاں میں ٹھٹکی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا چاند کی آخری تاریخیں ہر طرف اندھیرا گھپ اور اس پر یہ خوف کہ صبح کو جو دیکھے گا۔ مار ڈالے گا رستہ کا پتہ نہیں کہ کدھر جاؤں غرض بچوں کو لے کر سیدھی ہو لی۔ سلطان جی پہونچ کر مجھے معلوم ہوا۔ "ہم نظام الدین" میں ہیں۔ فرخ نے پانی مانگا مگر میرے پاس پانی کہاں۔ اس کو بہلاتی پھسلاتی لئے جا رہی تھی۔ کہ دو آدمیوں کی آواز سنائی دی۔ جان نکل گئی۔ اور سمجھی کہ ظالم آ گئے۔ سڑک چھوڑ پگڈنڈی پر ہو لی۔ دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ اور جان کا اللہ ہی وارث تھا۔ کہ پو پھٹی اور ایک گاؤں کی صورت نظر آئی۔

اب میں نے اپنا بھیس بدلا دوپٹہ سر سے باندھا اور سلیم کی اچکن پہن کر اچھا خاصا لڑکا بن گئی۔ گاؤں کے پاس ایک ٹوٹی سی مسجد تھی ہم تینوں وہاں پہنچے ایک بڈھے سے گنوار نے غلط سلط آذان دی اور ہم کو غور سے دیکھتے ہی چھوٹتے ہی کہنے لگا شہر سے بھاگے ہو۔"

میں نے بھی نماز پڑھی مگر کیا خاک پڑھی۔ دل کا اللہ ہی بیلی تھا۔ سلام پھیر چکی تو بڑے میاں سے کہا "اس لڑکی کو پیاس لگی ہے۔"

انھوں نے ایک میلے کچیلے مٹکے کی طرف اشارہ کیا جو کوٹھڑی میں رکھا تھا ٹوٹے ہوئے کلڑ سے پانی بھرا پانی اوک سے پلایا۔ تو بڑے میاں نے اتنی مہربانی کی کہ ہم سے کہا "تم لوگ بھوکے ہو گے چلو میں کھانا کھلا دوں" ہم ان کے ساتھ ہو گئے بھوک کے مارے پتلا حال تھا۔ ان کے گھر پہونچے تو معلوم ہوا بڑے میاں بڑھئی ہیں۔ انھوں نے غور سے ہماری صورتیں دیکھیں اور کہنے لگے۔

"مال مصالحہ تو بہت سارے ہو گے ہمارا حصہ تو دلواؤ۔"

میں نے کہا "تلاشی لے لیجیے کھوٹا بادام بھی پلّے نہیں بھوکے مر رہے ہیں ہمارے پیٹ بھر دیجیے۔"

بڑھئی خاموش تھا۔ اس کی بڑھیا بیوی اندر سے تین باسی روٹیاں اور پیاز کے گٹھے لائی۔ ہم کو وہی غنیمت ہو گئے۔ اس عورت کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کر رہی تھی کہ اس نے فرخ کو دیکھ کر کہا۔

"تم کو روٹی نصیب نہیں اس بچی کو کہاں لئے لئے پھرو گے خدمت کرے گی پیٹ پالے گی۔" اس کو ہمارے گھر چھوڑ جاؤ۔

میری تو یہ سن کر جان نکل گئی۔ بڑھیا میری بچی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

"یہ تو دلی کی انگنائی ہے، دن بھر گورے کالے آتے رہتے ہیں، تم کو بھاگنا ہے تو جلدی سے بھاگ جاؤ۔ دونوں کمیلے چلے جاؤ۔ گاؤں بھی اچھا ہے اور بچا ہوا بھی ہے" میں اس کا منہ تکنے لگی۔ فرخ روئی تو بڑھیا نے اس بری طرح ڈانٹا کہ توبہ بھلی۔ بڑھئی اپنے کام پر چلا گیا۔ ہم دونوں اپنی تقدیر کو رو رہے تھے۔ بڑھیا اپنی لٹیا لے کر جنگل کو گئی۔ اور میں اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر ایک طرف ہولی تھوڑی دور جا کر ایک چھوٹا سا مقبرہ دکھائی دیا۔ گوروں اور کالوں سے زیادہ بڈھے بڑھیا کا ڈر تھا کہ کب آئیں اور کدھر سے آئیں۔ تینوں اس مقبرے میں گھسے۔ اور دن وہیں گذرا بھوکے پیاسے لوٹ لوٹ کئے، رات کو نکلے تو سڑک پر ایک کوٹھری میں دو مٹکے سے دکھائی دیے یہ پیاؤ تھی پیٹ بھر کر پانی پیا۔ لٹیا بھر ساتھ لی اور آگے بڑھے صبح ہوتے ہوتے

"فرید آباد" پہونچے ہم تھک کر چور ہو گئے تھے اور پاؤں میں موٹے موٹے چھالے پڑ گئے تھے "فرید آباد" کے ایک قاضی صاحب نے ہم کو مہمان بھی رکھا۔ اور خاطر تواضع بھی کی مگر یہ کہہ دیا کہ "یہاں زیادہ عرصہ رہنا ٹھیک نہیں۔ مخبر ادھر بھی آتے جاتے ہیں تم لوگ جلدی کوچ کرو" میں اتنا سُنتے ہی پریشان ہو گئی۔ اور شام ہی کو وہاں سے چلتی بنی۔ دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب "ہیمپا" پہونچے یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ ہر طرف سے ہم پر لعنت برسنے لگی۔ بھنگیوں اور چماروں کی طرح ہم کو جھُوٹی روٹی کے ٹکڑے ملے۔ اور الگ پانی پلایا۔ بھوک میں کواڑ بھی پاپڑ ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرا۔ کہیں میرا دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ تو ایک موٹے جگادری ہندو نے دوپٹہ یہ کہہ کر اُتار دیا۔

"ارے یہ تو عورت ہے"

میں چور بنی کھڑی تھی۔ کہ دو تین ہندو میرے دونوں بچوں کو پکڑ لے گئے اور مجھ سے کہا تو مخبر ہے نکل یہاں سے نہیں تو ابھی سر کھائے ڈالیں گے"

ایک شخص میرا ہاتھ پکڑ کر سڑک پر چھوڑ گیا۔ اور یہ کہہ گیا اب گاؤں میں قدم رکھا تو جان کی خیر نہیں"

اب میں کس طرح بتاؤں کہ بچوں سے چھُوٹ کر میری کیا کیفیت ہوئی دن بھر بڑ کے نیچے بیٹھی روتی رہی۔ اور خدا خدا کر کے شام ہو گئی۔

ابھی رات کی سیاہی پوری چھائی نہ تھی کہ امتا بڑ کے نیچے سے اُٹھا کر گاؤں میں لے آئی۔ جھُٹ پٹا وقت تھا گوالنیں اپنی گائے بھینسوں کا دودھ دوہ رہی تھیں اور آنے جانے والے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے میرا دل ہَوا ہو رہا تھا۔ اور دم پر دم

بنی ہوئی تھی کہ اب کسی نے پکڑا مارا، اور نکالا۔ تھوڑی دیر ایک ٹیلے کے پیچھے چھپی لیکن یہاں بھی چین نہ پڑا۔ نکلی منہ گاؤں کی طرف کیا۔ مگر ہمت نہ پڑی اور ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ابھی جھٹ پٹا ہی تھا۔ کہ عورتوں اور مردوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں گھی کے چراغ ہاتھ میں لئے مندر کی طرف جانے لگیں شاید کوئی میلہ ہوگا۔ جس کا پورا حال مجھے معلوم نہیں، جب مندر کھچا کھچ بھر گیا۔ تو میں اسی گھر میں پہونچی۔ جہاں میں نے اپنے بچے چھوڑے تھے جھانک کر دیکھا تو ایک بڈھا پڑا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اور دونوں بچے سامنے بیٹھے تھے۔ سوچتی تھی کیا کروں۔ بچوں کو کیوں کر بلاؤں۔ مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تھی۔ دل کڑا کیا جان پر کھیل کر اندر قدم رکھا تو بڈھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے بچوں کو اٹھایا۔ بڈھا اونگھتا ہی رہا۔ اور میں بچوں کو ساتھ لے کر باہر آگئی۔ اب چاروں طرف اندھیرا گپ تھا۔ البتہ مندر سے بھجنوں کی اور جنگل سے گیدڑوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے میرے دونوں بچے بھاگے چلے جا رہے تھے مجھ کو اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ بچوں کے دھڑکے نے نیم جان کر دیا تھا جسم کی تمام قوت جمع ہو کر ٹانگوں میں آگئی تھی۔ اور شفقت مادری اس توسن کو مہمیز کر رہی تھی — یہاں تک کہ رات کی سیاہی نے کائنات کا ساتھ چھوڑا۔ اور ہم ایسے پہاڑ کے دامن میں پہونچے۔ جہاں مرغ کی آواز انسانی آبادی کا پتہ دے رہی تھی۔ بچے بھوک کے مارے رو رہے تھے۔ میں تو خیر دن بھر کی بھوکی پیاسی اعمال کو بھگت اور تقدیر کو رو رہی تھی۔ معصوم بچے نہ معلوم کس گناہ میں پکڑے گئے تھے۔ کہ تن کو چیتھڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ پاؤں کے چھالوں میں سے پانی اور ہاتھ کی کھرنچوں سے خون بہہ رہا تھا مگر دھجی تک میسر نہ تھی۔ کہ پٹی باندھ دیتی۔ رات جس نے اپنی زندگی میرے بچوں

کے ساتھ رہنمائی کو وقف کر دی تھی دم توڑ چکی اور دن ہم خانماں برباد دل کے استقبال کو آگے بڑھا مگر رات کی دیوی کا سایہ ہمارے واسطے نعمت تھا جس نے اپنا سیاہ لباس دن کو اوڑھا کر کرۂ دنیا پر ڈھکیلا۔ اس کے خوفناک چہرے میں آفتاب کا کچھ ایسا ذخیرہ چھپا ہوا تھا کہ ننھے منے دل ہل گئے اور سلیم بخار میں مبتلا ہوا اور فرخ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ گاؤں کچھ فاصلے پر تھا۔ مگر نہر قریب ہی جا رہی تھی۔ اب اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ میں نے اپنی پھٹی ہوئی رضائی املی کے نیچے پانی کے قریب بچھائی اور دونوں بچوں کو وہاں لٹا کر فرخ کا سر دبانے بیٹھ گئی۔

چہرۂ آفتاب کی ترقی کے ساتھ میرے بچوں کے مکھڑے تمتمانے شروع ہوئے ذرا بھی پہلا پہر ختم نہ ہوا تھا کہ سلیم بالکل ہی بے سرعت ہو گیا۔ رات بھر کا جاگا اور پانچ چھ کوس کی تکان، اس پر بھوک اور پیاس۔ در نہیں، گھر نہیں۔ مجھ پر جو گزری بیاں ہیں کر سکتی۔ ہوا ہماری غذا تھی۔ اور املی کی پتیاں ہماری مہمان نواز فرخ نے پانی نگا۔ میں چلو بھر پانی لائی۔ کہ دو موٹے موٹے لٹھ کندھوں پہ رکھے جاٹ آ دھمکے اور پوچھا۔

”تم کون ہو اور یہاں کیوں ٹھہرے ہو۔

میں نے منت سے کہا ”ہم مسافر ہیں تھک کر چور ہو گئے۔ بچوں کو بخار ہو گیا م لے رہے ہیں دوپہر ڈھلے آگے بڑھ جائیں گے۔“

ایک جاٹ جس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں بگڑ کر بولا۔ تم لوگ شہر سے بھاگے ر۔ ہم کو بھی پکڑواؤ گے۔ یہاں سے آگے بڑھو۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”بچے بیمار ہیں دیکھو۔ بخار چڑھ رہا ہے تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے لو چل رہی ہے

گرمی تیز ہے، اب چلے تو بن آئی مر جائیں گے۔

اس نے لٹھ زمین پر پٹخا اور کڑک کر کہا۔ "اُٹھا بچوں کو!! آگے بڑھ!" میری رُوح فنا ہو گئی۔ اگر اس نے میرے لٹھ مار دیا تو پھٹکا بھی نہ کھاؤں گی۔ اور کسی بچے کے پڑ گیا تو سی بھی نہ کر سکے گا۔ فرخ کو گود میں لیا سلیم کو اُٹھایا، وہ کھڑا نہ ہو سکا دُوسرے جاٹ کو مجھ پر رحم آ گیا۔ اور کہا "اچھا بیٹھ جاؤ" یہ کہہ کر وہ دونوں چلے گئے۔ اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہی بے چارہ تین موٹی موٹی روٹیاں لے کر آیا۔ میں نے اس کو ہزاروں دعائیں دیں بچّے تو کیا کھاتے۔ میں نے ایک روٹی کھائی۔ اور دو رکھ لیں۔ کہ اگر ان میں سے کسی نے ٹکڑا مانگا۔ تو دے دوں گی۔ دوپہر سے پہلے ہی لُو کے جھکڑوں نے میرے لالوں کو جُھلسانا شروع کیا ہَوا کے تھپیڑے منہ پر طمانچے مار رہے تھے۔ اور بخار زدہ معصوموں کے منہ پر پپڑیاں بندھ رہی تھیں آسمان انگارے برسانے لگا زمین شعلے اُگلنے لگی۔ مامتا کی ڈبی ہُوئی آنکھیں دو حصّوں میں تقسیم ہو رہی تھیں۔ ایک نگاہ سلیم پر تھی۔ دوسری فرخ پر۔ اٹکل سے میں دو کا وقت سمجھ کر نہر پر وضو کرنے بیٹھی۔ کہ وہی رحم دل جاٹ آ پہونچا اور اس کی آواز نے چونکا دیا۔

"ارے یہ تو عورت ہے"

میں تھر تھر کانپنے لگی۔ کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ ہزاروں قسم کے خوف تھے۔ مگر خُدا ان کا بھلا کرے میں تو کہتی ہوں سینکڑوں مسلمان اس ہندو پر قربان مجھ سے کہنے لگا۔ "بہن چل میرے گھر چل" میں اس کا منہ تکنے لگی۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "ڈر نہیں تُو بہن اور میں بھائی"

فرخ کو میں نے گود میں لیا اور سلیم کو اس نے پیٹھ پر۔ میں ڈرتی ڈرتی اس کے

گھر پہونچی۔ تو اس کی بیوی شوہر سے زیادہ ملنسار تھی۔ بچوں کی طبیعت دوسرے دن ٹھیک ہوگئی۔ اور دونوں میاں بیوی نے ایسی محبت سے رکھا کہ اب بھی خیال آتا ہے تو بےساختہ دعا نکلتی ہے میں ڈیڑھ مہینے تک اس گھر میں رہی۔ جاٹ جاٹنی نے پردیس کو دیس بنا دیا۔ جب میں نے سن لیا کہ شہر میں امی جمی ہوگئی۔ تو ادھر کا رخ کیا۔ بھائی جاٹ خود ہم کو یہاں تک پہنچانے آیا۔ اور میرا رونگٹا رونگٹا اس کو ہر وقت دعائیں دیتا ہے۔

مظفر سلطان کی داستان اس قدر دلچسپ اور درد انگیز تھی۔ کہ ”بیلے کا میلہ“ سبلانیوں کی سیر اور دوکانداروں کا کاروبار سب خاک میں مل گیا۔ ”جو تھا وہ“ گوہری تنبو“ میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ کچھ ایسا سناٹا چھایا کہ جو تھا وہ دم بخود! مظفر کا بیان ختم ہوا۔ اور شہزادیوں کے نالے دلی کے آسمان کا کلیجہ توڑ چکے۔ تو گوہر آرا بیگم نے میزبان کی حیثیت میں یہ الفاظ کہے“

مظفر سلطان نے بتا دیا۔ کہ قلعہ معلّٰی کی بسنے والیاں جنھوں نے گرمی کے دن خس کی ٹٹیوں میں گذارے۔ لُو کے تھپیڑوں اور املی کے پتوں میں بھی زندہ رہ سکتی ہیں۔ مگر کون کہہ سکتا تھا۔ کہ خود حضور عالی پر کیا کچھ نہ گزر جائے گی“

حضور کا نام زبان پر آتے ہی دلی والے تڑپ اُٹھے۔ اور ”ہائے بادشاہ“ کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہوئے۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ یہ کہرام مچتا رہا۔ تو شمع زہرا بیگم کے سامنے آئی۔ زہرا بیگم جہاں پناہ کی بھانجی تھیں۔ وہ ابھی یہ ”کچھ کہنے نہ پائی تھیں۔ کہ گوہری تنبو میں یہ آواز گونجی۔

”لپٹیں آرہی ہیں مونیا کی“

گوہر آرا بیگم بولیں ” خالہ جیتی رہو غنیمت ہے تمہارا دم کہ روتی صورتوں

کو ہنسا دیتی ہو" ہنسی اب کہاں ہم سب اُجڑ گئے اور اُجڑا دیار ہے یہ شہر —

شہزادیِ زہرہ بیگم کی داستان!

"بیلے" کے بازار جہاں تھوڑی دیر پہلے ایسی چہل پہل اور گہما گہمی تھی کہ کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ اس وقت سناٹے میں تھے۔ اور تمام میلہ سمٹ سمٹا کر "گوہری تنبو" میں آگیا تھا۔ گوہر آرا بیگم کا فقرہ ختم ہوتے ہی ایک دفعہ بیگم پھر جھکی۔ اور وہی صدا دوبارہ گونجی —

"لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

بیگم کے دونوں پہنچے موتیا سے چوٹی دار بنے ہوئے تھے۔ ایک گجراتی دوسرے میں دیسی۔ ہوا ان کی خوشبو سے مست ہو رہی تھی۔ اور انسانی دماغ جو بادشاہ کا نام سنتے ہی اپنی بدبخت آنکھوں سے آنسو گرا چکے تھے۔ خاموشی سے جھوم رہے تھے۔ شاہی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ برسوں کے بعد شہزادی زہرہ بیگم کو لال قلعہ کا سماں یاد آگیا۔ گذرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی راتیں کلیجے پر چھریاں چلانے لگیں۔ لمحہ بھر ہو کا عالم رہا۔ آخر گوہر آرا بیگم نے پہلے پانوں کی کشتی مظفر سلطان کے سامنے رکھی اور پھر زہرہ بیگم سے کہا —

"ہاں بیگم" اب تم اپنی بپتا سناؤ۔ خدا نے دوبارہ ملوایا ہے، ہمکو تو امید تھی نہیں"

زہرہ بیگم نے ہنس کر گوہر آرا بیگم کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔

"جس خدا نے بچھڑوایا تھا۔ اسی نے ملوادیا۔ میں اپنی داستان کیا سناؤں!

دل میں زخم ہیں اور زخموں میں ٹیسیں ہیں۔ شہر جہاں پناہ کے ساتھ اُجڑ گیا۔ اب ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے۔ خدا کی شان ہے۔ ہمارا قلعہ جس کی دُھوپ میں ہمارا بچپن جوانی سے بدلا۔ اور جس کی چھاؤں میں ہمارے نال گڑے تھے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہم سے دیدے بدل چُکا۔ اور ہم اس کی صُورت کو ترس رہے ہیں۔ نیم کی پتیاں اور پیپل کی کونپلیں جس وقت ہوا میں سرسراتی ہیں۔ اور یہ ہری بھری شاخیں اور سرسبز ٹہنیاں جب ہوا میں تیرنے والے پرندوں کو اپنی گود میں لیتی ہیں۔ اور آزادی کے گیت گانے والی چڑیاں جس وقت تھرک تھرک کر درختوں پر بیٹھتی ہیں۔ اور چہچہاتی ہیں۔ اُس وقت دل ہوا ہوتا ہے۔ کلیجے کے ٹکڑے اُڑتے ہیں — شہر کی آبادی کا سماں وہ دن یاد دلاتا ہے جن کی شام اب صبح کی صُورت نہ دیکھے گی۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ تقدیر کا لکھا بھگتنا۔ اور بھُگتیں گے۔

شہر سے ہم تیرہ عورتیں اور مرد نکلے۔ دونوں وقت کی پھانسیوں نے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ روز ارادہ ہوتا تھا کہ بھاگیں اور جان بچائیں۔ لیکن بڑی چچی جان کا بخار دم بھر کو نہ اترتا تھا۔ ایک تو ہر وقت چڑھا ہی رہتا تھا۔ دوسرا اور چڑھا بڑھاپا اور یہ بخار۔ ڈھانچ رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ ان میں خود ہمت نہ تھی کہ اُٹھ کر پانی پی لیں چھوڑ سکتے تھے نہ لے سکتے تھے — آخر خالو جان نے یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح ہو نکلو مخبر پیچھے لگ گئے ہیں۔ اور کالا نوجوان کا دشمن ہے کیا خبر کِس کِس کو پھانسیاں دلوا لے۔ آج چچا جان کو پکڑوا دیا۔ بلا سے آپا جان کو کندھے پر لے چلیں گے۔ مگر موت کے منہ سے نکلیں گے۔ اور موت آ ہی گئی ہے تو خُدا کی مرضی!

بارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گھر سے نکلے گہنا پاتا پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ برتن بھانڈا اور کپڑا لتّا زمین کھود کر دبا دیا۔ اور بھرا ہوا گھر خدا کے سپرد کر۔ جدھر منہ اُٹھا چل کھڑے ہوئے۔ خالو جان نے اپنی پیٹھ پر بجّی جان کو لیا۔ وہ بخار میں ہل ہلا رہی تھیں۔ ان کی ہائے ہائے نے اور بھی دم ناک میں کر دیا تھا۔ "آکا مرزا" بھی ساتھ تھے وہ کہتے تھے ہُو کی آواز نہ ہو۔ بجّی جان کی کھانسی لحمہ بھر کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ راج گھاٹ پر پہونچ کر ہم سب ٹھٹھکے پار جانا تھا۔ اور بیچ میں جمنا لہریں لے رہی تھی کیسی مصیبت کا سامنا تھا۔ اندھیری رات اور بچے ساتھ "خالو" مچھلی کے شکار کے رسیا تھے۔ دریا کا چپہ چپہ ان کا دیکھا ہوا تھا۔ وہ دُور تک اپنے ساتھ لے گئے "نگم بودھ" کے پاس جا کر کہا۔ لو اُترو یہاں پانی ٹخنے ٹخنے ہے" کیا بتاؤں دریا کیوں کر پار کیا۔ پوری منزل طے کی۔ اور پھر قلعہ ہی کے پاس تھے بچوں کو گود میں لیا۔ مردوں کا ہاتھ پکڑا۔ اور ایک ایک کر کے ادھر پہونچے۔

"منجھلی نانی اماں" سب سے زیادہ جنکار رہی تھیں۔ انھیں کا پاؤں رپٹا اور دھڑام سے گریں مختصر یہ کہ خدا خدا کر کے پار پہونچے بچے کپکپا رہے تھے۔ بجّی جان کی کھانسی نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ کتے بھونکتے رہے ہمارا تو ہر طرف خالو جان نے لکڑیاں بٹھاریں۔ اور ہم سب ایک طرف کھڑے ہو گئے گھڑی گھنٹہ تو ہمارے پاس تھا نہیں۔ کوئی تین بجے ہوں گے۔ "مرزا" نے کہا "چلو جلدی چلو ابھی شہر ہی میں ہیں۔ صبح ہو رہی ہے کسی نے دیکھ پایا تو یہیں ڈھیر ہوں گے۔ ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ مجھ کمبخت کے پاؤں میں ڈھیلا پاجامہ تھا۔ بھاگی تو بھاگا نہ گیا۔ سب سے پیچھے رہ گئی۔ اور جب سب نکل گئے تو چلائی خدا کے لئے ٹھیرو۔

میں بھی آ رہی ہوں۔ ہم لوگ مشکل سے دو کوس گئے ہوں گے۔ اور ایک گاؤں میں پہونچے۔ یہ ٹھاکر گڑھ تھا ہندو مسلمان دونوں آباد تھے۔ ان لوگوں کے لئے ہم تماشہ ہو گئے۔ جو آتا دو چار باتیں بناتا اور ہنسی اُڑاتا۔ بھوکے بھی تھے اور پیاسے بھی ایک گوجر نے لٹھ پھرا کر کہا۔ یہ بھگوڑے ہیں۔ ان کو شہر لے چلو انعام ملے گا۔ ہماری تو یہ سُن کر جان نکل گئی۔ مگر وہ اصل میں مذاقیہ آدمی تھا کیوں نکہ اسی شخص نے سب سے زیادہ ہمدردی کی۔ اور پھر دوپہر کا کھانا اسی نے کھلایا۔ دن پہاڑ ہو گیا۔ کہ کسی طرح کٹتا ہی نہ تھا۔ اور ہم اس فکر میں تھے کہ ذرا جھٹ پٹا ہو اور آگے بڑھیں۔ گاؤں والوں نے ہم کو پریشان نہ کیا۔ اور ہم نے جس طرح ممکن ہوا۔ دن بسر کیا۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھیں۔ مگر مصلحت یہ نہ تھی شام ہوتے ہی چل پڑے۔ بچے نیند کے جھونٹوں میں جھول رہے تھے اور بڑوں کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ دس بجے ہوں گے کہ چچی جان کو بخار چڑھا۔ گرمی کے دن تھے لحاف رضائیاں ساتھ نہ تھیں۔ بخار سردی سے آیا۔ سب ان کو لپٹ گئے مگر کپکپی کسی طرح نہ تھمی۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کو پیاس تھی۔ وہاں پانی کہاں؟ ایک لُٹیا میں "توتلی پھوپی جان" کے بچہ کے واسطے دو گھونٹ ساتھ لے لئے تھے۔ وہی کام آئے۔ مگر اس سے کیا ہوتا؟ آخر ایک درخت کے نیچے بچھونے بچھائے اور سوچا کہ یہاں دم لیں۔ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ تندرست کی خبر نہ بیمار کی۔ آنکھ کھلی تو سورج سر پہ تھا۔ مگر سامنے ہی ایک ٹوٹا گنبد تھا۔ بھاگ کر وہاں جا چھپے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ آکا اور خالو باہر نکلے۔ گاؤں بہت دور تھا۔ ہم نے ان کو نہ جانے دیا۔ بچے بھوک کے مارے بلو بلو کر رہے تھے۔

اور خود ہماری انتڑیاں بھی قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ مگر نہ کچھ کر سکتے تھے نہ ہو سکتا تھا۔ رات سر پہ آ گئی۔ اور گیدڑوں کے غل غپاڑے کے ساتھ بچوں کی چیخم دھاڑ نے اور بھی قیامت برپا کی۔ آگے بڑھے مگر بدن میں سکت نہ تھا۔ بچوں کو گودوں میں لیا۔ خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ کہ وہ کس طرح تماشے دکھاتا ہے۔ دور فاصلے پر ایک دھندلی سی روشنی نظر آئی۔ ہم ایک کونہ میں وہاں بیٹھ گئے۔ اور دونوں مرد وہاں پہونچے تو وہ چنے کی دوکان تھی۔ وہ چنے بریانی بن گئے چنے والا بھی بھلا مانس تھا چنے بھی کھلائے پانی بھی پلایا۔ ذرا پیٹ میں پڑی تو آگے بڑھنے کی سوجھی۔ مگر ادھر دیکھتے ہیں تو بچی جان ٹھنڈی برف پڑی ہیں۔

آکا نے دیکھ کر کہا: "ان کی نبضیں بھی جا چکیں" جھنجھوڑ کر آوازیں دیں۔ لیکن اُن کو ہوش نہ تھا۔ حالت لحظہ بہ لحظہ غیر ہو رہی تھی۔ اندھیرا گھُپ۔ صُورت بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ سانس سُنا۔ تو وہ بھی کچھ ٹھیک نہ تھا۔ مختصر یہ کہ کھرا اُتو بولنے لگا۔

میں سمجھتی ہوں دُنیا میں اس سے زیادہ دردانگیز موتیں کم ہوں گی۔ شہد اور دوا تو درکنار پانی تک نصیب نہ تھا۔ یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کب گذریں۔ اور کیوں کر گذریں۔ خالہ سکندر نے کہا۔ ہو چکیں میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ مر بھی گئیں یا نہیں۔ راتوں رات گڑھا کھود کر وہ بھی کس طرح کتلوں سے اُلٹا سیدھا۔ ان ہی کے کپڑوں میں جو بدن پر تھے دبا دیا۔ اور روتے بلکتے روانہ ہو گئے۔

صبح ہم کو "وکیانی" میں ہوئی یہ مسلمانوں کا گاؤں تھا۔ ادھر یہاں آکا میاں کے ایک دوست رہتے تھے۔ وہ ہم سب کو گھر لے گئے اپنی ذات سے بہت نیک آدمی تھے لیکن ان کی بیوی ایسی دماغ چڑھ رکھتیں کہ خدا کی پناہ! سیدھے منہ بات

کرنی ہی قسمت تھی۔ نیک بخت نے بیسنی روٹی پکائی گھی کی ہنڈیا پاس تھی کھایا۔ بچوں کے ہاں بھی لگایا۔ مگر ہم کو رُوکھی دی میں نے کہا اچار ہوتا تو اچھا تھا۔ اُٹھی اور مرچ کی چٹنی سامنے لا رکھدی۔ ہم دو دن اور دو رات وہاں ٹھہرے مگر اس کی بدمزاجی سے بہت پریشان ہوئے۔ اور تیسرے دن آگے روانہ ہو گئے۔

یہاں تک پہنچ کر زہرہ بیگم خاموش ہو گئیں۔ پانوں کی تھالی اپنے آگے گھسیٹی اور مسکرا کر گوہر آرا بیگم سے کہا: "آپ کے آج کے میلے نے تو اچھے اچھے مشاعروں کو مات کیا کہ جہاں تک نظر جاتی ہے۔ آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔"

گوہر آرا بیگم بولیں بیوی یہ بھی کوئی دن کی بات ہے۔ چند روز بعد شہر اور شہر والے ان رنگوں کو بھول بسر جائیں گے۔ نئے نئے لوگ ہوں گے نئی نئی باتیں ہوں گی۔ دیکھو تو بادشاہ کے کیسے کیسے جاں نثار جو پسینے پہ خون بہانے کو تیار تھے خون کے پیاسے ہو گئے اور نمک حراموں نے جھوٹی گواہیاں دیں۔ ابھی انکی حسرت کا نام زندہ ہے۔ کہ ہم جیسی لونڈیاں موجود ہیں۔ تمہارے بعد کوئی نام بھی نہ لے گا جن کے قدموں سے دلی اور دلی والوں نے آنکھیں ملیں۔ اس کی روح فاتحہ کو ترسے گی۔ اور دو روٹیاں بھی نصیب نہ ہوں گی۔ سچ پوچھو تو بیلہ میں میلہ اور جنگل میں منگل تمہارے دموں سے ہوا۔

ہائے تقدیر! چچی جان غریب کو کفن نصیب ہوا نہ قبر ملی۔ اُن ہی کپڑوں میں خدا کے سامنے گئیں۔ دیکھو خدا اپنی قدرت کے تماشے کس طرح دکھاتا ہے۔ کیسی نازک مزاج بیوی تھیں۔ بچھونوں پر سلوٹ ہوتی تھی تو ناک بھنویں چڑھا لیتی تھیں۔ یہ خبر نہ تھی کہ میت کو غسل بھی نصیب نہ ہوگا۔

زہرہ - اجی حضرت غدر نے جو مصیبت عورتوں اور مردوں پر ڈالی ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خیر وہ تو مر کر سب بلاؤں سے چھوٹ گئیں۔ زندوں کو فرمائیے ان پر کیا گذر رہی ہوگی۔

گوہر آرا بیگم: ہاں بیوی سچ کہتی ہو مگر جب صاحب عالم جہاں پناہ ہی پر ایسی گذری کہ آسمان و زمین کانپ گئے۔ اور بھوکے پیاسے گھر سے رخصت ہوئے تو ہم لونڈی غلام کس گنتی میں۔"

ابھی گوہر آرا بیگم کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک متفقہ آواز بلند ہوئی اور لوگوں نے تقاضہ کیا آگے فرمائیے۔"

زہرہ بیگم نے ہنس کر کہا۔ "بہت اچھا" پھر وہ سنبھلیں اور کہنے لگیں۔ تیرہ آدمیوں میں سے ایک تو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اب ہم بارہ آدمی تھے۔ دوپہر کے وقت ایک بڑ کے درخت کے نیچے ذرا دم لیا۔ گاؤں یہاں سے قریب تو نہ تھا مگر دکھائی دے رہا تھا۔ پیاس کے مارے پپڑیاں بندھ رہی تھیں کہ ایک طرف سے گانے کی آواز آئی۔ یہ لاؤ والوں کی صدائیں تھیں کیا بتاؤں عید کے چاند کی بھی اتنی خوشی نہ ہوگی۔ جتنی کہ اس وقت اس زور کی ہوئی۔ ہم سب لپکے مگر مردوں نے ہم کو روکا اور خود گئے لاؤ والا بے چارا کوئی شریف آدمی تھا۔ اس نے ایک گھڑا پانی بھر دیا۔ اور آکا نے آکر ہم سب کو پلایا۔

بچوں نے پھر رونا شروع کیا۔ اور بھوک سے بلکنے لگے۔ مگر ہو ہی کیا سکتا تھا۔ آخر "مالکو جان" گاؤں کی طرف گئے۔ اور خدا جانے بھیک مانگ کے یا اپنی داستان مصیبت سنا کر چار روٹیاں اور دو گٹھیاں پیاز کی لے کر آئے اور

ٹکڑا ٹکڑا سب کو دیا۔ ہم سب نے سوکھی روٹیوں کا ایک ایک ٹکڑا کھایا۔

بریانی اور متنجن میں بھی وہ مزہ نہ ہوگا جو اس وقت کے ٹکڑے میں آیا۔ کھا پی، آگے بڑھے بچوں کے پاؤں سوجھ گئے تھے اور خون نکل آیا تھا۔ مگر کیا کر سکتے تھے، اسی طرح چلتے گئے۔ شام کے قریب "کیرانہ" کے پاس ایک گاؤں میں پہونچے۔ یہ مسلمانوں کا گاؤں تھا اور یہاں کا جو مکھیا تھا وہ سانس کے مرض میں بیمار تھا۔ دُنیا بھر کے علاج کر ڈالے۔ مگر کسی طرح آرام نہ ہوا۔ اتفاق سے اس کا ایک نوکر کنوئیں پہ پانی بھرنے آیا۔ ہم لوگ بھی وہیں ٹھہرے تھے۔ خدا کی قدرت عجیب ہے وہ ایسے تماشے دکھاتا ہے۔ کہ عقل دنگ ہو جاتی ہے۔

نوکر نے کسی آدمی سے اپنے مالک کی حالت بیان کی "ہمارے خالو" جنہوں نے عمر بھر شکار کھیلا اور کچھ نہ کیا۔ دمہ کی دوا جانتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ تین دن میں دھوئیں کی طرح نہ اُڑا دوں تو سب کے مُنہ اُڑا دینا" اس نے جاکر گھر میں ذکر کیا۔ اُسی وقت وہاں سے دو آدمی ہم کو لینے آ گئے۔ اور خوب آؤ بھگت ہوئی۔ دونوں وقت دودھ اور گھی کی نہریں بہتی تھیں۔ خالو تو حکیم جی بن گئے ان کی دوا سے تین دن میں مرض جاتا رہا۔ تب تو سارا گاؤں ان کے قدم لینے لگا دو مہینے تک ہم وہاں رہے۔ جب ہم چلنے کا نام لیتے گاؤں والے روک لیتے آخر خدا خدا کر کے وہاں سے رُخصت ہوئے۔ دو بڑی بیل گاڑیاں انھوں نے ہم کو دیں اور ایک آدمی یہاں تک ساتھ آیا۔ کھانا اس قدر ساتھ تھا کہ دس اور ہوتے تو کافی ہو جاتا۔

ہم یہاں پہونچے تو امی جمی ہو چکی تھی مگر گھر کے گھر سنسان ہو چکے تھے اور بعض محلے تو ایسے اُجڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ گدھے کے ہل پھر گئے۔

قلعہ کو دیکھ کر کلیجہ پہ سانپ لوٹتا تھا۔ باہر کی دیواریں دیکھ کر اندر کی عمارتوں پر فاتحہ پڑھی اور صبر و شکر سے رہنے سہنے لگے۔ مگر دل پر جو گذری اور گذر رہی ہے۔ وہ دل ہی جانتا ہے۔ کیسے کیسے جوان برابر کی سہیلیاں اور ہمجولیاں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں کہ دل ڈھونڈھ رہا ہے۔ لیکن حضور ہی نہ رہے۔ تو کس کے عزیز اور کہاں کی سہیلیاں ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

زہرا بیگم ٹھٹھکیں، تو گوہر آرا بیگم کے اشارے سے شمع قمر زمانی بیگم کے سامنے آئی۔ یہ صاحب عالم کی بھانج بہو تھیں ان کے شوہر محمد شاہ اور ایک جوان لڑکا غدر میں مارے گئے۔ جب کالا مخبر قسم کھا گیا۔ کہ دم میں دم ہے تو باقی دونوں لڑکوں کو بھی پھانسی دلواؤں گا۔ تو شہر سے بھاگ گئیں۔

شہزادی قمر آرا بیگم کی بِپتا

گوہر آرا بیگم نے کہا "قمر بوا اب تم اپنی بیتی سناؤ کہ یہ سب مشتاق ہیں تو انھوں نے آنسو پونچھے اور کہنے لگیں۔

"جب مرزا صاحب اور بچہ اللہ کو پیارے ہوئے تو میری حالت دیوانوں کی سی تھی۔ کالے خاں جاسوس نے میرے بے گناہ بچے پر ستم توڑا اس کا بدلہ اس کو مل گیا چالیس دن کے اندر ہی اندر ایسا تاراج ہوا۔ اور ایسی پڑی کہ دشمن پر بھی خدا نہ ڈالے جب وہ میرے بچوں کی فکر میں تھا۔ تو میں نے ایک دن دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑا باہر نکلی بھرا گھر تھا کیا کیا یعنی برتن بھانڈا کپڑا لتا زمین میں گاڑ جدھر منہ اٹھا چلتی ہوئی۔

بڑی خرابی یہ تھی کہ رات کو نکلتی تو رستہ کا پتہ نہ تھا۔ اور دن کو جاتی تو پکڑا دھکڑی ہو رہی تھی۔ جھُٹ پٹا ہو رہا تھا۔ کہ میں نے دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑا۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ لاہوری دروازہ ہے یا کابلی دروازہ۔ بڑے لڑکے نے جو اللہ رکھے اب گیارھویں میں ہے۔ بتایا کہ یہ اجمیری دروازہ ہے" گوروں کا پہرہ اور ان کی کریہیں تلواریں دیکھ کر جان نکل گئی۔ چھوٹے نے کہا۔

اماں بیوی! کھائی کھائی چلو کھڑکی میں سے نکل جائیں گے"

مجھ کمبخت کو کیا خبر کھائی کہاں ہے۔ اور کھڑکی کدھر، اس کے پیچھے ہولی۔ وہ ننھا بچہ مگر سچا تھا۔ چلتے چلتے ایک ٹوٹا دروازہ ملا اسی کو کھڑکی کہتے ہیں۔ یہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہم باہر نکلے تو خاصی ڈیڑھ گھڑی رات گذر چکی تھی اور چاندنی اچھی طرح نکل آئی تھی۔ بڑے نے کہا۔ یہ ادھر تو بستی نظام الدین ہے اور دوسری طرف، گڑگانواں ہے۔ ہم نے نظام الدین کی سڑک چھوڑ دی۔ اور گوڑگانوہ کی طرف ہو لئے۔ ابھی تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ ادھر سے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز سنائی دی۔

بس دم نکل گیا۔ بچوں کو لے کر ایک پیپل کے درخت کے پاس جا چھپی۔ تین گورے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے جارہے تھے۔ کاٹھیوں میں کبوتر اور فاختہ اور خبر نہیں کیا کیا پرندے بندھے ہوئے تھے۔ یہ شکاری لوگ تھے۔ وہ نکل گئے تو جان میں جان آئی۔ آگے بڑھی تو چھوٹا ننھا کہنے لگا۔" ہم تو تھک گئے اور بھوک لگ رہی ہے" میں اپنی افراتفری میں روٹی لینی بھول گئی نہیں تو دو روٹیوں میں گھی لگا کر نمک ڈال لیتی۔ اس کو بہلاتی پھسلاتی چلی جا رہی تھی اور دل ہوا ہو رہا تھا۔ کہ موئے گیدڑوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ چاند کی

شروع تاریخیں گھنٹہ دو گھنٹہ کی بہار دکھا کر چندا ماموں نے بھی ساتھ چھوڑا۔ اب ہم تین دم جنگل کا سناٹا اور ہوا کا فراٹا۔ برقع میں جو ہوا بھری تو کُپا ہو گیا بہتیرا ٹھیک کرتی ہوں مگر وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ خدا خدا کر کے اُتارا اور چلی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو چھوٹا سڑک پر بیٹھا مُنہ بسور رہا ہے کہ روٹی دو۔

میں نے بہتیرا ہی سمجھایا بڑے نے چمکارا مگر وہ قبضہ میں کہاں مچل گیا۔ چلانے لگا۔ یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ کوئی سُننے والا نہ تھا آخر تڑپ تڑپ کر بچہ سو گیا تو بڑے نے پیٹھ پر لادا اور آگے بڑھے صبح ہوتے ہی ہم شہر سے چار کوس دُور نکل گئے یہاں کسی زمانے کا ٹوٹا ہوا مدرسہ تھا۔ اس کے پاس گاؤں بھی تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ایک تالاب بھی نظر آیا میں نے وضو کیا۔ اور مدرسہ میں آ کر نماز پڑھی۔ بڑے کا انگرکھا اُتار کر ایک گوشہ میں بچھایا تو نیچے کنکر تھے۔ ہاتھوں سے ان کو صاف کیا۔ اور جھاڑ کر دوہرا کر دیا انگرکھا بچھا دونوں کو اس پر لٹا دیا۔ وہ دونوں رات بھر کے تھکے اور جاگے ہوئے سو گئے تو مجھ کو خیال آیا کہ چھوٹا اُٹھتے ہی روٹی مانگے گا۔ برقع اوڑھ باہر نکلی۔ اور سامنے ایک گھر میں جا کر سوال کیا۔ تو ایک بڑھیا باہر نکلی۔ اور مجھ سے پوچھا کہ تو کون ہے۔ اور کہاں سے آئی ہے میں اس سے کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ ایک جوان سا آدمی میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ڈانٹ کر کہا "تو شہر سے بھاگی ہے ہم تجھ کو پکڑ کر شہر پہونچائیں گے" خدا معلوم وہ کمبخت کیا کرتا۔ کہ اور دو چار آدمیوں نے اس کو دھمکایا۔ اور میری پوری کیفیت معلوم کر کے مجھ کو چار روٹیاں اور میٹھا دیا۔

میں میٹھا اور روٹی لے کر مدرسہ آئی۔ چھوٹا بچہ بے خبر اور بڑا بیٹا میری راہ

دیکھ رہا تھا۔ ایک روٹی تو میں نے بڑے کو دی ایک آپ کھائی اتنے میں چھوٹا بھی اُٹھ بیٹھا اس کے آگے رکھ دی۔ ہم کھانا کھا رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ "خالہ سردار" کی بیٹی بی خُوبن لڑکتی مٹکتی چلی آ رہی ہیں۔ میری تو جان میں جان آ گئی۔ کہ پردیس میں خُدا نے فرشتہ بھیج دیا۔ خُوبن عورت کیا آفت کی پرکالا تھی۔ آتے ہی مارے ہنسی کے پیٹ میں بل ڈال دیئے۔ میں بھی ساری بپتا بھول گئی۔ ایک روٹی اس کو دی۔ روٹیاں موٹی موٹی تھیں۔ اور ایک بہت تھی۔ دونوں بچوں نے تو اس میں سے بھی ٹکڑا چھوڑ دیا۔ کھا پی چکے تو بھلا خوبن کیا نچلی بیٹھنے والی تھیں۔ میں نے بہتیرا کہا کہ چُپ کی بیٹھ جا۔ مگر وہ کیا ماننے والی تھی کہنے لگی۔ میں تو سارے رستے ہی اُچھلتی کودتی آئی ہوں میرے ساتھ چار اور رہتے تو پیٹ بھر دیتی تو کھڑی ہو میرے ساتھ چل۔

میں اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ ایک ایک گھر میں سنگنیاں لیتی تھی۔ ایک گھر میں سے کسی بیمار کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہاں کان لگا کر دیر تک سنتی رہی اور پھر اس زور سے کنڈی بجائی کہ میں ڈر گئی ایک بڈھا اندر سے نکلا تو کڑک کر کہنے لگی۔

"بیمار کا کیا حال ہے۔ اب تک آرام نہیں ہوا" وہ آدمی ہکا بکا ہو کر رہ گیا اور کہنے لگا "جی تم کون ہو" گھر مسلمان کا تھا۔ بی خوبن نے زور سے کلمہ پڑھا اور کہا۔

"ہم کو کیوں پُوچھتا ہے۔ فقیر ہیں۔ حکم ہوا۔ آ گئے۔ صبح آگے بڑھ جائیں گے جلدی بتا کیا حال ہے"

بُڈھے نے غور سے صورت دیکھی تو خوبن نے زور زور سے الحمد پڑھنی شروع کی۔ اور کہا۔

"دیکھتا کیا ہے دوا بھی لے دُعا بھی لے۔ دُور۔ دُور۔ بیماری دُور۔ لول کیا

چاہتا ہے اور دیکھ سات دن میں تیرے گھر پر بلا نازل ہونے والی ہے۔ آگ لگے، مُردہ نکلے، ڈھور مرے۔ سُنا ولی آئے۔ بیمار کو دم کا پانی دیئے جا، جادُور، بلا دُور،،

بُڈھا سوچتا ہی رہا کہ کیا کرے اتنے میں اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت دروازہ میں آئی۔ اور کہنے لگی "کیا ہے" بُڈھے نے جواب دیا۔

"ہے کون۔ اللہ نے اپنے مہمان بھیجے ہیں۔ آجا۔ کوئی مرد نہیں ہے" میں اب تک سہم رہی تھی۔ مگر اب مجھے بھی ہنسی آنے لگی۔ خوبن نے عورت کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

بیمار کا یہ حال کر دیا۔ اچھا اب بھی ہُشیار رہو۔ مسجد میں چراغ جلاؤ دُور دور۔ بلا دُور"

خوبن نے اتنا ہی کہا تھا۔ کہ عورت قدموں پہ گر پڑی۔ اور کہنے لگی۔ میرا لڑکا بخار میں پڑا ہے اندر چل کر دیکھ لو۔ مرد بولا "نانی جی کہتی ہیں۔ بلا نازل ہونے والی ہے" عورت تو اتنا سُنتے ہی خوبن کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کہ "رحم کرو"

میرے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور خوبن اکڑ رہی تھی۔ "دُور، دُور، دُور" کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عورت اور مرد دونوں سامنے آ کھڑے ہوئے ایک نے ہاتھ جوڑے ایک نے پیر پکڑے ان کے کہنے سُننے اور منت خوشامد سے خوبن کلمہ درُود پڑھتی ہوئی لوٹیں۔ مجھے انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ پیچھے پیچھے رہوں اور ہاتھ جوڑے رہوں۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی ان سے دو قدم پیچھے میرے ساتھ تھے۔ خوبن گھر میں داخل ہوئیں۔ تو عورت لپک کر آگے بڑھی اور چراغ دکھایا۔ باہر کے چبوترے پر بیمار ہائے ہائے کر رہا تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اور بخار چڑھا ہوا تھا۔

خُوبن نے جھُونٹ مُونٹ نبض دیکھی اور زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ڈھائی سیر خُشکہ، ڈھائی سیر گھی، ڈھائی سیر دہی، ڈھائی سیر کھانڈ ابھی تیار کرد اس کا بخار میں لے لیتی ہوں" اتنا سُنتے ہی دونوں ماں باپ کی جان میں جان آئی۔ یہ ترکیب خوبن نے اس لئے کی کہ جب دیکھ لیا کہ پنڈا پسیج رہا ہے اور بخار اُترنے والا ہے گاؤں میں کیا کمی تھی سب سامان آگیا۔ خُوبن نے اس میں سے دو نوالے کھائے اور آواز لگائی۔

"دُور، دُور بلا دُور۔ بُخار دُور"

چل چل اس کے پاس سے چل۔ آ آ میرے پاس آ" جا جا۔ میرے پاس آ۔ مریض کا بخار اتر ہی رہا تھا بی خوبن خُشکہ لے وہیں مدرسہ میں آئیں۔ اور ہم سب نے مِل کر کھایا۔ اور پڑ رہے۔ صبح ہوتے ہی عورتیں اور مرد کھٹ کا کھٹ موجود تھے کہ "پیرانی جی کہاں ہیں" میرے فرشتوں نے بھی یہ سوانگ نہ دیکھے تھے۔ میں نے تو کہدیا "بوا خوبن میرے بس کا روگ نہیں۔ مگر بڑا ننھا اس کے ڈھب پر چڑھ گیا۔ ایک لکڑی لے کر باہر بیٹھ جاتا۔ اور جہاں لوگ آئے آواز سے کہہ دیتا۔

"ٹھہر جاؤ پیرانی جی نماز پڑھ رہی ہیں"

چار پانچ دن میں سارا گاؤں بی خوبن کے قدموں میں تھا۔ مجھ کو تو ایسے کھانے ملے کہ میں قلعہ بھی بھول گئی۔ روز مُرغ پکتے تھے۔ کیوں کہ خوبن جو تعویز لکھتی تھیں وہ مُرغ کے خون سے۔ دُور دور کے لوگ آنے لگے۔ اور بی خوبن کی وہ پُوجا ہوئی کہ خُدا کی پناہ۔ مدرسہ میں ہم کوئی آٹھ دس دن ہی رہے ہوں گے۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا مکان جو بارہ دری کے نام سے مشہور تھا۔ ہم کو مِل گیا۔ کھانا تو ہم کو کبھی پکانا پڑا نہیں۔

اور چاروں طرف سے اتنا آتا تھا کہ ہم جیسے بیس آدمیوں کو کافی ہوتا۔ دونوں وقت دو مٹکے دودھ کے آتے تھے۔ خوبن کے صدقہ میں ہماری بھی عزت ہو گئی۔ پیرانی جی تو ایسی پجیں۔ کہ آس پاس کے گاؤں بھی ان کے قدموں میں آگرے۔ ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا۔ میرا ننھا اب مکھن تھا۔ جو کچھ آتا تھا۔ اسی کے ہاتھ میں اور جس کا کام اٹکتا تھا۔ وہ اسی کی خوشامد کرتا تھا۔ کہ پیرانی جی دعائیں کریں تو کام ہو جائے۔

ہم کو یہاں رہتے ہوئے خاصے دو ڈھائی مہینے ہو گئے کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ خوبن کے پاس دو ڈھائی روپے کے پیسے نقد نہ آجاتے ہوں۔ بڑا ننھا تیسرے چوتھے روز روپیہ بندھوا لیتا تھا۔ خوبن کا تو کام چل رہا تھا وہ کیوں گھبراتی مگر اب میرا دل اکھڑ گیا۔ اور میں نے ان سے کہا۔ کہ "اب گھر چلنا چاہیئے" وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئی۔ اس خبر سے لوگ اور زیادہ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ غرض خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے تین مہینے کے اقرار پر اجازت لی۔ عورتیں اور مرد اس طرح رو رہے تھے۔ جیسے کوئی اپنا عزیز جاتا ہے۔ صبح کی نماز کے وقت ہم گاڑی میں بیٹھے۔ اور شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ دوپہر کو ایک گاؤں میں جس کا نام "گرنت" تھا۔ ہم لوگ ٹھہرے۔ کھانا بہت کافی تھا۔ اچھی طرح پیٹ بھر کر کھایا۔ کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیا اور درختوں کی چھاؤں میں تھوڑی دیر لیٹے۔ گاڑی بان نے بیلوں کے آگے کٹی ڈالی پانی پلایا وہ بھی سستا لیا تو کوئی تین بجے کے قریب ہم آگے بڑھے۔ مگر ایک بات سے میں کھٹک رہی تھی۔ کہ گوجر گاڑی بان رستے بھر اکڑ اکڑ کے اور اکھڑ اکھڑ کر باتیں کر رہا تھا۔ ننھے نے کہا "بھئی ذرا کم بول۔ پیرانی جی سو گئیں ہیں" تو اس نے جواب دیا "ایسی ایسی پیرانیاں بہت دیکھی ہیں" ہم سمجھ رہے تھے

کہ پانچ چھ روز میں شہر پہونچ جائیں گے۔ اور چلتے وقت بھی یہ ہی سب نے کہا تھا کہ بیل موٹے اور جوان ہیں۔ یہ بچھڑے دوہری منزل طے کریں گے۔ ہم دلی چھٹے روز داخل ہوں گے۔ مگر اب اس کمبخت نے کہا کہ پورے پندرہ روز لگیں گے۔ دلی یہاں رکھی ہے اسی کوس جگہ کیا منہ کا نوالہ ہے" میں نے دیکھا کہ اس کے تیور بگڑ رہے ہیں اور وہ رستے میں دغا دے تو کوئی تعجب نہیں۔ اس لئے رات تو ہم نے گاؤں میں گذاری۔ خوبن اور بچے پڑے سوتے رہے میں رات بھر نہ سوئی" گوجر کمبخت بھی رات بھر جاگتا رہا۔ اور جب وہ اٹھا میں کھنکاری آخر اس نے کہہ ہی دیا۔ تجھے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی میں نے خوبن سے کہا۔ الٹی لوٹ چل یا تو ایک آدمی ساتھ لے یا گاڑی والا بدل" مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور ہم سب دلی کی طرف چلے دوپہر کو کنویں کے پاس دم لیا۔ اور دو گھنٹے سستا کے آگے بڑھے۔ رات ہم کو "میناپورے" میں ہوئی۔ یہ مینوں کا گاؤں تھا۔ میرا ماتھا نام سنتے ہی ٹھنکا۔ مگر خوبن کا دل شیر تھا وہ نہ ڈری اور ہم سب چوپال کے پاس اترے گوجر ہم کو چھوڑ غائب ہو گیا۔ اور دس بجے رات کے آیا۔ تو بی خوبن اور دونوں بچے کھا پی کر سو گئے تھے۔ گوجر نے مجھ سے کہا "تیری نیند کون لے گیا۔ کل بھی تو رات بھر جاگی۔ اور آج بھی نہیں مرتی ہمارے ہاں سے۔ بہت کچھ کما کر لائی ہے وہ سب اگلنا پڑے گا" میں نے جلدی سے خوبن کو جگایا۔ اور اب جو دیکھتی ہوں تو چار آدمی موٹے موٹے لٹھ لئے سر پر کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ اگر آواز نکالی تو ابھی مغز پھاڑ ڈالیں گے۔ جو کچھ پاس ہو سب رکھ دو" پیرانی جی ذرا چھیلی تھیں۔ اور اتنا ہی کہنے پائی تھیں کہ ہم فقیروں کے پاس کیا خاک رکھا ہے" کہ ایک شخص نے

اس کے مُنہ پر زور سے تھپیڑ دیا۔ اور کہا اب اور بول "۔ اس کے بعد تلاشی ہوئی۔ جو کچھ پاس تھا سب چھین لیا۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ موسم گرما تھا۔ ورنہ اور مصیبت آتی۔ اس میلے کچیلے جوڑے کے سوا جو بدن پر تھا دانت کُریدنے کو تنکا تک نہ رہا ہمارے ساتھ آٹا اور گھی بہت تھا۔ اور ہم سمجھتے تھے گھر پہنچ کر بھی کھائیں گے مگر وہ بھی چھین لیا۔ اور اس کے بعد انھوں نے دیا سلائیاں جلا کر میری اور خُوبن کی صورتیں دیکھیں۔ ہماری بھی تقسیم ہوئی اور اسی طرح دونوں بچوں کی بھی باری آئی۔ وہ بھی تقسیم ہوئے میں نے کہا چھوٹا بچہ بھی میرے ساتھ رہے تو اچھا ہے نہیں تو مر جائے گا۔ لیکن کسی نے نہ مانا۔ اور ہم جس جس کے حصے میں آئے تھے اس کے ساتھ چلنے پر مجبُور ہوئے بچوں کی جُدائی میں

میں نے ایک ایک کے آگے منت سماجت کی قدموں پر سر رکھا لیکن وہ ظالم کیا مانتے۔ میں جس کے پلے پڑی وہ سخت مزاج تو نہ تھا۔ مگر اُسکی گھر والی نے مجھے لونڈیوں کی طرح رکھا۔ میری اصلی مصیبت کا آغاز اسی جگہ سے ہوتا ہے۔

میں صبح چار بجے سے اٹھا دی جاتی تھی۔ اور مویشیوں کا گوبر جمع کر کے اُپلے تھاپتی تھی اس کے بعد ان ڈنگروں کی سانی اور کٹی کرتی جب دو پہر ہو جاتی تو ان کو لے کر جنگل نکل جاتی چلتے وقت گھر والی دو موٹی موٹی روٹیاں مجھے دیتی میں جنگل ہی میں مُولیاں توڑ کر روٹی کھاتی۔ شام کو چار بھینسیں اور تین گائے لے کر آتی تو پھر ان کے دھندوں میں لگ جاتی۔ اگر کام سے ذرا غفلت کرتی تو مینا پہلے گالیاں سُناتا اور پھر بے تحاشہ مارتا اور مارتے مارتے کہتا رہتا۔

" مارے لکڑیوں کے سر پھاڑ دوں گا "

کوئی دن اور کوئی رات ایسی نہ جاتی تھی کہ میں اپنے بچوں کی یاد میں آنسو نہ بہاتی۔ میں نے ایک دن دل کڑا کر کے بچوں کا حال پوچھا تو اس نے کہا۔ "تیرے دونوں بچے اچھے ہیں بڑا تو ذرا دُور ہے مگر چھوٹا پاس کے گاؤں میں ہے۔ اب وہ بھی کام کاج خاصا کرتا ہے میں پچھلی سوموار کو گیا تھا۔ اگر تو اچھا کام کرے گی تو تجھ کو اس چھوٹے سے ملوا دوں گا۔ میں اُس کے قدموں میں گر پڑی کچھ اس کو مجھ پر رحم بھی آگیا۔ اور کہنے لگا۔" اچھا آج دوپہر کو یہ سامنے جھنڈ ہے اس کے پاس نیچے "پربت نگر" میں آجائیو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ تیرا چھورا بھی وہیں ہے۔" میں نے اس کو ہزاروں دعائیں دیں اور دوپہر سے پہلے ہی پہنچ گئی۔ تو دیکھا کہ پربت پر وہ بدنصیب ایک چھوٹا سا سر کنڈا لئے ہوئے بھینسیں چرا رہا ہے۔ میری جان میں جان آگئی۔ اس کو کلیجہ سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ آخر میئے کے کہنے سے اس کو چھوڑ کر گاؤں آگئی۔

سات مہینے اسی طرح گذر گئے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں ندی پر ڈھوروں کو پانی پلا رہی تھی۔ دُوسری طرف میں نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ وہ بھی پانی پلا رہا ہے مجھے اپنے بڑے لڑکے کا شُبہ ہوا آوازیں دیں مگر اس تک نہ پہونچیں۔ تو جانوروں کو چھوڑ کر آگے بڑھی تو وہ میرا بڑا بچہ ہی تھا۔ آواز سُنتے ہی تڑپ اٹھا دوڑ کر آیا اور کلیجہ سے چمٹ گیا ہم دونوں اسی طرح رو رہے تھے کہ ایک شخص چیختا ہوا آیا اور بچہ کا ہاتھ پکڑ کر الگ گھسیٹ لیا۔

بچہ کا چھٹنا میرے واسطے قیامت تھی۔ میں نے گھر پہونچ کر اپنے چودھری کو سارا واقعہ حرف بہ حرف سُنایا وہ بعض دفعہ میرے کام سے جب خوش ہوتا تھا۔

تو رحم سے کام لیتا تھا اور تعریف بھی کرتا تھا۔ اس وقت تو خاموش رہا۔ مگر دو تین روز کے بعد خود ہی کہنے لگا۔ ”اچھا میں تیرے لڑکے کو ملوا دوں گا۔“ میں اس روز سے بلاناغہ دوپہر کے وقت اسی جنگل اور تالاب پر جاتی۔ مگر پھر مجھ کو نہ بچہ ملا نہ وہ ڈھور ملے۔ ایک دن کا ذکر ہے جھٹ پٹا وقت تھا کہ چودھری میرے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر آیا اور کہا۔ ”دیکھ میں نے اس سے کہہ دیا ہے اگر یہ رہنا چاہے تو یہاں شوق سے رہ کسی کی پرواہ نہ کر گاؤں والے دنگا مچائیں گے تو میں ان سے سُلٹ لوں گا۔ میں یہ سُنتے ہی باغ باغ ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی کا شکریہ ادا کیا۔ اور مینے سے کہا۔ ”جہاں آپ نے اتنا احسان کیا ہے اتنا اور کیجئے کہ چھوٹے کو بھی ملوا دیجئے۔ ہم تینوں ان ڈھوروں کی خدمت پیٹ بھر کریں گے۔ میناؔ یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور اپنے لڑکے سے کہا۔ ”جا پربت نگر سے اس کے چھورے کو لے آ۔

”میں کس زبان سے خدا کا شکر ادا کروں رات کو وہ لڑکا بھی آ گیا میں نے اس سے چپکے سے پُوچھا۔ ”ارے خوبن کی بھی کچھ خبر ہے“ تو وہ کہنے لگا۔ ”ہاں وہ تو ہمارے ہی گاؤں میں ہے۔“ میں اس سے باتیں کر رہی تھی کہ پربت نگر کا نمبردار آن پہونچا۔ اور بگڑ کر کہنے لگا۔ ”چھورے کا اچار ڈالا ہے۔“ ہمارے چودھری نے کہا۔ ”ارے دبا کر۔ دونوں چھوکرے آئے ہیں کل چلے جائیں گے۔“ بات بڑھ گئی اور اس نے کہا۔ ”میں ابھی لے جاؤں گا۔“ ہمارے چودھری کو بھی ضد آ گئی اور اس نے قسم کھالی کہ کل بھیجوں گا۔“ لیکن بارہ بجے رات کے پربت نگر والے گئے۔ اور یہ کہہ گئے۔ کہ صبح خون خرابے ہوں گے۔“ ہمارے چودھری نے مجھ سے کہا۔ کہ تو دونوں بچوں کو لے راتوں رات بھاگ جا۔ صبح جو کچھ ہو گا میں

ان کو دیکھ لُوں گا۔" میری تو جان میں جان آگئی مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ خوبن کو بھی خبر کر دوں۔ میں نے اسی وقت چھوٹے کو لپکایا کہ جا کر خوبن کو چُپکے سے لا۔" بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ اور میرا ہی دل گردہ تھا کہ جلتی آگ میں بچہ کو ڈال دیا۔ مگر خدا کا کرم تھا کام بن گیا۔ اور بی خوبن آگئیں۔ اس وقت ہمارے چودھری نے تھوڑا سا آٹا اور پیاز کی گٹھیاں ساتھ کیں اور کہا "جاؤ بھاگ جاؤ۔"

ایک یا دو بجے ہوں گے ہم چاروں وہاں سے نکلے خدا کی قدرت کے قربان جایئے رات چاندنی تھی صبح ہوتے ہی ہم کسی گاؤں میں پہونچے اور لوگوں کی آنکھ بچا کر ایک باغ میں گھس گئے۔ خوبن نے کہا۔ باغ میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں یہاں لوگ آئیں گے الگ چلی چلو۔ ہم نے کنواں تو بھانپ لیا اور آگے بڑھ کر ایک بڑ کے نیچے ڈیرا جمایا آٹا گوندھا آگ سُلگا کر موٹے موٹے روٹ ڈالے دو پہر سے پہلے ہی پہلے روٹیاں تیار ہو گئیں اور کھانے بیٹھے۔

اب ایک مزے کی بات سُنو ایک اُچکا ورہی بندر خدا معلوم کب سے بیٹھا تاک رہا تھا میری آنکھ ادھر ہوتے ہی روٹیوں کی تھئی کی تھئی لے چلا میں اور خوبن بڑا اور چھوٹا بھئیا چیخے اور چلائے۔ مگر وہ کمبخت کیا چھوڑنے والا تھا درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ چٹیل میدان میں صرف یہ ایک درخت ہے باقی آس پاس کوئی درخت نہیں۔ کب تک نہ اُترے گا۔ اور کتنی کھائے گا۔ ہم چاروں نے اس کے پتھر مارنے شروع کئے۔ مگر وہ کمبخت ایسا مضبُوط ہو کر بیٹھا۔ اور روٹیاں چھاتی سے لگائیں کہ پتھر پر پتھر پڑ رہے تھے لیکن روٹی نہ چھوڑتا تھا۔ خوبن کا ایک پتھر کھوپڑی پر ایسا لگا کہ بھِنّا گیا اور سر سہلانے لگا۔ روٹیاں نیچے گریں تو ہم نے اٹھا لیں

اور کھانے بیٹھے۔ دن اسی طرح ہم نے گزارا۔ شام کو تھوڑی سی روٹیاں اور
پکالیں اور آگے بڑھے۔

سڑک پر پہونچے تو پربت نگر کی ایک بڑھیا کھڑی چلی جا رہی تھی ہم کو دیکھ کر بہت بھپلی اور کہنے لگی: ”ابھی گاؤں کے لوگوں کو بلا کر تم کو پکڑواتی ہوں میٹوں کی چوری کی اور یہاں بھاگ کر آئے“۔ میں نے جتنی اس کی خوشامد کی نامراد اُتنی ہی سر پر چڑھی۔ اور لگی غل مچانے۔ آخر خوبن نے سر کے بال پکڑ کر کہا: ”آواز نکالی تو جان سے مار ڈالواں گی“۔ یہ کہہ کر دونوں ہاتھ خوبن نے پکڑے۔ اور ایک پاؤں بڑے نے ایک چھوٹے نے ڈنڈا ڈولی بنا کر خوبن اس کو ایک جنگل میں لے چلیں۔ مجھے تو خبر بھی نہ تھی کہ چار پانچ گز گہری ایک کھو یہاں تھی خوبن نے دیکھ لی تھی وہاں پہونچ کر لگی بڑھیا ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے کہ ”رحم کرو اور چھوڑ دو“۔ میں تو شاید چھوڑ دیتی مگر لڑکے راضی ہوئے نہ خوبن۔ اونہوں نے مل کر اس مردود کو پھینک دیا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ چوٹ کہاں لگی۔ مگر خوبن نے کہہ دیا تھا کہ ”رات تک آواز نکالی تو مارے پتھروں کے بھرکس کر دوں گی“۔

اب ہم بھاگم بھاگ چلے اور دم بھر کے لئے کہیں نہ ٹھکے۔ صبح ہم کو شاید ”پانی پت“ میں ہوئی۔ یہاں پہونچ کر ہماری جان میں جان آئی۔ اور ہم نے جنگل ہی میں اسیرا لیا۔

ہم کو یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اب خدا کے فضل سے شہر میں امن بھی ہے اور یہاں کے مسلمانوں نے ایک محل سرا میں دلی کے بھاگے ہوئے آدمیوں کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ وہ دو دو دن رہ کر جہاں جانا ہو چلے جائیں۔ ہم

چار بندے بھی اس محل سرا میں دو دن رہے۔ کھانے کا انتظام خاصا تھا۔ لنگر کی روٹی جیسی ہوتی ہے۔ خیر خدا کا شُکر ادا کیا۔ اور پیٹ بھرا۔ ہم کو یہ بھی معلُوم ہوا کہ بادشاہ سلامت کا مقدمہ ہو رہا ہے۔ اور نمک حراموں نے زور شور سے حضور کے خلاف گواہیاں دی ہیں۔ اُوپر کا سالن اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کہ چار دن کی زندگی کے واسطے کیسے کیسے کمبختوں نے اپنا منہ کالا کیا۔

مقدمہ کی خبر سُنتے ہی ہوش جاتے رہے پر نہ سکتے کہ اُڑ کر پہونچ جاتے۔ دوسرے ہی دن ہم کو خبر لگ گئی کہ مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ اور سرکار رنگون بھیج کر قید کر دیئے جائیں گے۔ اس خبر کو سُنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب شہر نہ جاؤں گی۔ مگر پردیس میں بھیک کب تک مانگتے اور کیا کرتے۔

”پانی پت“ سے چل کر ہم ”بہرپور“ میں آئے۔ ایک دن ایک رات ٹھہر کر آگے بڑھے تو بی خوبن کو رستے میں بخار چڑھ آیا۔ ان کے لینے کے دینے پڑ گئے کہیں تیسرے دن ان کا بخار اُترا تو گھر کا رُخ کیا دہلی پہونچکر شہر کی جو کیفیت دیکھی تو کلیجہ پر گھونسے لگ رہے تھے۔ جدھر نظر جاتی تھی۔ سنسان! اور جس چیز کو دیکھتی تھی اُجڑی ہُوئی حضور بادشاہ روانہ ہو چکے تھے۔ اس خیال نے تمام امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور دل زندگی سے سیر ہو گیا۔ مگر جو کچھ گذری خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح گذری۔!“

یہاں تک بیان کرنے کے بعد شہزادی قمر آرا بیگم کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ان کے آنسوؤں نے شمع جھلملا دی۔ اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو

آسمان کروٹ لے رہا تھا۔ اور تارے دامنِ شب سے جُدا ہو رہے تھے۔
بیگم نے اپنے پھولوں کی لپیٹ سے مجلس کو مست کیا۔ اور کہا" بیبیوں"
شمع جھلملا گئی۔ اور پھول ٹھٹھرا گئے۔ رات ختم ہوئی۔
"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

شہزادیوں کا نالہ ختم ہو چکا اور وہ رات جس نے مدتوں کے بچھڑے ملائے کبھی کی رخصت ہوئی یہ متبرک صورتیں جنھوں نے شاہجہاں آباد اور اس کے حکمراں پر فاتحہ کے پھول چڑھائے میرے سامنے ایک ایک کر کے اٹھی ہیں شاداب پھولوں کا یہ گلدستہ جس کی خوشبو نے دماغ مُعطر کئے! دلی، اور بہادر شاہ کو رونے والے جن کی آنکھوں نے بیکلے میں موتی برسائے، میرے روبرو فنا ہوئے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے، اس مضمون کو کہانی سمجھیں، یا قصہ، مگر میرے دل سے پوچھو، کلیجے کے ٹکڑے اُڑتے ہیں۔ جب وہ سماں یاد آتا ہے، جس وقت عالمِ خیال وہ صورتیں سامنے لاتا ہے، اور حافظہ مٹنے والی مُورتیں سامنے لا کھڑی کرتا ہے۔ تو دلِ وحشی ٹکریں مارتا ہے۔ وہ رات جس کے ہر لمحہ میں صداقت و انسانیت کے خزانے دفن تھے اپنے ساتھ بہت کچھ نہیں سب کچھ لے گئی۔ شاہجہاں آباد اپنی رونق اور چہل پہل وداع کر چکا۔ جن گھروں سے محبت و ایثار کے چشمے پھُوٹے، جن دہلیزوں نے حفاظت کے ڈنکے بجائے آج سُنسان و خاموش ہیں۔ اور جن محلوں کی سرزمین سے درسِ وفا کی آندھیاں اُٹھی ہیں، وہاں اس وقت خاک اُڑ رہی ہے۔!

شہر کی بہت سی عمارتوں کے آثار کھنڈر بنے ہوئے ابھی تک نقشِ پا کا پتہ دے رہے ہیں۔ پھول والی بیگم کی صدا "لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی" جو شاہجہاں آباد کی فضائیں گونجی ہے اور جو اس رات کی شمع اور جو اس بزم کی عروس تھی، مُدتیں ہوئیں فنا ہو چکی۔ مگر اس کی لہک ابھی تک میرے کانوں میں بس رہی ہے۔ اور جب کبھی "فراشخانہ" کے سامنے سے گذرتا ہوں تو آنکھیں اس ٹیلے کو ڈھونڈتی ہیں۔ جہاں سے یہ صدا بلند ہوئی تھی۔ اور چمپیوں کے پھول خاندان تیموریہ کی بدبخت بیگمات کے انقلاب کی داستان سُناتے تھے۔

جس وقت زمین اور آسمان خاموش آنسوؤں میں رات کو وداع کر رہے تھے اس وقت کا دردانگیز منظر انسانی نظر بہت کم دیکھے گی۔ شمع کی روشنی اور تاروں کا اُجالا دونوں پھیکے پڑ چکے۔ دنیا اپنے چہرہ سے رات کا برقع سرکا رہی تھی آسمان کی سیاہی آہستہ آہستہ سپیدہ صبح میں جذب ہوئی اور تیموری بیگمات کا دستہ بادِ سحر کے جھونکوں سے کھلنے کے بجائے مُنتشر ہوا جب صحبت شب کی یادگار، مرے ہوئے پان مُرجھائے ہوئے پھول بکھری ہوئی چھالیاں اور فرش کی سلوٹیں باقی رہ گئیں تو ایک متفقہ صدا بلند ہوئی۔ اور بادشاہ کی مغفرت کی دعا ہوئی۔ اس وقت تماشائیوں نے جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ گوہر آرا بیگم سے درخواست کی کہ زیادہ انتظار ہمارے واسطے پہاڑ ہوگا۔ حضور کی جُدائی نے ہمارے دلوں میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ رات نے ہمارے زخموں کا مداوا کیا۔ اور آپ نے چکنا چُور دلوں پر مرہم کے پھائے رکھے کل بسنت تھی۔

آج میلہ ہوا اور رات کو اسی میدان میں باقی داستان ختم کیجئے۔ "کوٹلہ" کے جانے میں زحمت ہوگی تو دل کے ارمان دل میں رہ جائیں گے۔ شام پکڑنی مشکل ہے رحم کیجئے اور ایک دن ہو یا دو دن لگاتار رکھیئے۔

اس درخواست پر سخت اصرار ہوا اور جب یہ طے ہوگیا۔ کہ میلہ تین روز اور رہے گا۔ تو لوگ خوشی کے مارے اُچھل پڑے اور دوکانداروں نے اپنی دوکانوں اور سیلانیوں نے اپنے ڈیروں کا راستہ لیا۔

شہزادی قیصر جہاں بیگم کی آپ بیتی

اُجڑا ہوا میلہ جہاں ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ تھے بیوہ کی طرح ایک دفعہ پھر دُلہن بنا جبیں عروس بہ دن ڈھلتے ہی افشاں چُنی جانے لگی۔ آج بھی بسنت کا وہی دور تھا اور قدرت بھی شہر والوں کے مجروح جذبات کی ہمنوائی کر رہی تھی۔ خودرَو پھولوں کی زردی نے میلہ کی شان دوبالا کردی ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی شمع نے اپنے آنسوؤں میں دِلّی والوں کو آج پھر دورِ گزشتہ کی یاد دلادی۔

"**گوہری نمبو**" کل سے زیادہ آراستہ تھا۔ اور خلقت اس طرح ٹوٹ رہی تھی۔ کہ بیٹھنے کو جگہ تھی نہ کھڑے ہونے کو۔ مجبوراً مچان بنایا گیا۔ اور تخت پر گوہر آرا بیگم غدر کی ماری شہزادیوں کو ساتھ لے کر بیٹھیں۔

جلسہ عشاء کے بعد شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے "پھول والی بیگم" نے

اپنے چھبیے کھولے موتیا کی بھینی بھینی خوشبو نے دماغ معطر کر دیئے اور تنبو میں یہ صدا گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

پیسہ پیسہ دو دو پیسے کے پھول بکنے شروع ہوئے ادھر گاہکوں کی آواز تھی کہ "ایک پیسے کے اور" "دو پیسے کے اور" اُدھر بیگم لہک رہی تھی۔

"کٹورا سے پھول موتیا کے"

موتیا ہے گجراتی

چونٹی دار دو چھبیے آدھ گھنٹے میں ختم ہو گئے تو گوہر آرا بیگم نے کہا۔

"بس بوا بیگم اب ایک چھبیا رہنے دو دیر ہو رہی ہے"

شمع گھومنی شروع ہوئی کچھ پڑھنے پڑھانے کو نہیں بلکہ مُسترر کی صورت دکھانے کو۔

سب سے پہلے گوہر آرا بیگم نے اپنے ہاتھ سے شمع قیصر جہاں بیگم کے سامنے رکھی۔ اور کہا "ہاں بیگم اپنی بپتا سنائیے لوگ مُشتاق ہیں"

قیصر جہاں بیگم نے پان کھایا اور مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔

دِلّی والوں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرو۔

الٰہی جہاں پناہ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب ہو۔

دعا ہو چکی تو قیصر جہاں بیگم نے کہا۔

نیاز علی مخبر جس کا دور دورہ تھا اور سچ پوچھو تو موت کی کل جس کے ہاتھ میں تھی میرے شوہر مرزا سکندر کی پھانسی کا حکم مجھ کو دوپہر ہی کو سُنا چکا تھا

اس نامراد کافر نے جو ستم توڑے ہیں فرعون اور نمرود نے بھی نہ توڑے ہوں گے۔ اس ناہنجار نے سینکڑوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ میرے شوہر سے اس کو سدا کی لاگ ڈانٹ تھی۔ اس نے جھوٹی مُخبری کی اور بیمار کو پکڑوا دیا۔ اس اندھیر کو دیکھو کہ گٹھیا کا بیمار جو چلنا پھرنا تو درکنار کھڑا تک نہیں ہو سکتا۔ کیا لڑے گا کیا مارے گا۔ مگر اندھیر نگری چوپٹ راج تھا۔ شاباش ہے اُن عقلوں پر جنھوں نے یقین کر لیا اور پھانسی کا حکم دیدیا۔ مرزا بے چارے نے لاکھوں قسمیں کھائیں اور بہتیرا ہی کہا "میری تو دونوں ٹانگیں رہی ہوئی ہیں" مگر کسی نے نہ سُنی نیازو کمبخت کی خدائی تھی۔ جس کو چاہا پِسّو اور کھٹمل کی طرح دم بھر میں مسل دیا۔ اس کم بخت کی صُورت دیکھتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے تھے کہ دیکھیے جوانا مرگ کس کی سُناؤنی لاتا ہے کہ اس نے چُگی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"مرزا جی جا رہے ہیں ملنا ہو تو مل لو اور چار پانچ گھنٹوں کے مہمان ہیں"

اماں جان اندر بیٹھی ختم پڑھ رہی تھیں سُنتے ہی دھم ہو گئیں اور باہر نکل کر کہا۔

الٰہی پھانسی لگے تجھے ڈھائی گھڑی کی۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے تو سمجھے غریبوں کا صبر خالی جائے یہ ہونا نہیں۔ خُدا اور اس کا رسول چاہے تو تن بدن میں کوڑھ ٹپکے گی اور تڑپ تڑپ کر مرے گا۔"

وہ ناشاد تو چکنا گھڑا تھا۔ سینکڑوں گھر اُجڑوائے مرزا بے چارے کس گنتی میں تھے یہ کہہ سیدھا ہو لیا "کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرتے" اور ہماری آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ ان دِنوں پھانسیاں دو جگہ ہوتی تھیں کوتوالی کے چبوترے پر اور جمنا کی ریتی میں۔ ہم دونوں ساس بہوئیں پہلے کوتوالی

گئے وہاں معلوم ہوا کہ شام کے پانچ بجے دریا پر باڑ ماری جائے گی۔ یہاں سے اُدھر گئے تو سینکڑوں بدنصیبیں کھڑی اور بیٹھی کلیجوں پر گھونسے مار رہی تھیں ٹکریں مار مار کر شام پکڑی عصر کے بعد۔ بے قصوروں کا قافلہ آیا۔ مرزا کو دیکھ کر اماں جان نے ایک چیخ ماری۔ اور چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ ایک فرنگی پلٹن آکر سب کو قطار میں کھڑا کیا۔ اور سپاہیوں نے بندوقیں چھوڑ دیں۔ بے چارے اللہ مارے تڑپ تڑپ کر چلتے ہوئے۔ اور جہاں پناہ کا فرمانا صحیح ہو گیا۔

نہ کفن ملا نہ وہ دفن ہوئے

نہ ہے فاتحہ نہ مزار ہے

اماں جان مرزا کے گرتے ہی لپکیں۔ وہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ گولی کنپٹی میں لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ اُنھوں نے سر اٹھا کر گود میں لیا اور پیار کرنے لگیں کہ اسی بدذات پیادے نے لاش چھین لی۔ اور دھکا دے کر کہا "بڑھیا آگے بڑھ" لاشیں بھنگیوں اور چماروں نے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیں اور ہم سب جدھر کا منہ اٹھا روتے پیٹتے چلے گئے۔

اماں جان بارہ مہینے کی بیمار تھیں اور جب سے بڑے مرزا کو گٹھیا ہوئی تھی دن دن بھر رات رات بھر وہاں روتی تھیں۔

عمر بھر کی کمائی یہی ایک دم تھا۔ سنبھل نہ سکیں میں ان کو لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ کہ ان کو زور کی کھانسی اٹھی اور کھانسی کے ساتھ ہی سانس اُکھڑ گیا۔ اور انھوں نے پانی مانگا۔ وہاں پانی کہاں۔ میں دریا کی طرف دوڑی چلو میں پانی لائی مگر وہ میرے پہونچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ اور اکیلی بیٹھی ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔ کہ نیازو کم بخت نے پیچھے سے آکر کہا۔

"ارے بڑھیا لڑھک گئی۔

اس کے ساتھ ایک سپاہی تھا دونوں نے مردے کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ یہ نمک حرام نیازو جو نانا جان کا غلام تھا۔ طوطے کی طرح دیدے بدل کر اپنی ہستی بھول جائے گا۔ رو رہی تھی کہ ہنستا ہوا آیا اور کہا۔

"اب تم مجھ سے نکاح کر لو"

میرے سر سے جو لگی تو تلووں سے نکل گئی بدن بیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس کے پٹھے پکڑ لیے اور کہا۔

"موئے پاجی تیری یہ ہستی کہ اس منہ سے نکاح کا نام لے"

مگر کجا میں عورت اور کجا وہ بدمعاش"

جھٹکا دے ہنستا ہوا سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ "اسی میں خیر ہے نہیں تو دو دو دانوں کو ترسو گی۔ ادب آداب کو پھونک دو۔ اور آج نکاح کر لو۔"

میرے بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ اور وہ ناشاد ہنسے جا رہا تھا۔ ایک کی ہزار سنائیں۔ مگر اللہ رے بے غیرتی۔ نوسو کی بندی کے ڈنڈ پر لکھی جو تا مرگ پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ شام ہو چلی تھی کہنے لگا اس جنگل میں کوئی شیر بھیڑیا یا دیو کھا جائے گا کب تک بیٹھو گی کیا کھاؤ گی۔ اور کہاں سوؤ گی۔

میں کیا بتاؤں کہ کیا گذری تھی جی چاہتا تھا۔ موئے کو کچا کھا جاؤں۔ آگے

بڑھ کر پھر پکڑا۔ اور دو ہتڑ پوٹے زور سے مارا۔ مگر اس ناشاد پر کیا اثر ہوتا میں اس کو کوس رہی تھی۔ کہ کسی نے پیچھے آ کر کولی بھر لی۔ ہاتھ اس نے پکڑے اور پاؤں کمبخت نیازو نے اور مجھ کو ڈنڈا ڈولی کر کے لے چلے۔ خدا ہی جانتا ہے آدھی رات تھی یا پچھلا۔ یہ دونوں ملعون مجھ کو ایک ٹوٹے ہوئے بُرج میں لائے اور نیازو نے چاقو نکال کر کہا۔ اگر آواز نکالی تو جان سے مار ڈالوں گا“

اب اور مصیبت یہ آئی کہ سپاہی مُوا تو قاضی بنا اور نیازو مردُود دولھا بنا قاضی جی جاہل تھے جن کو ایک حرف خطبہ نہ آتا تھا۔ اُنھوں نے نکاح پڑھایا۔ مجھ پہ جو بپتا پڑی۔ خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ جی چاہتا تھا کہ نابکاروں کو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی تک نصیب نہ ہو۔ مگر اب تو میں خود ہی مر رہی تھی مجھے اس وقت وہ سماں یاد آ رہا تھا جب بڑے ننھے کے پیدا ہونے پر جہاں پناہ نے خود عقیقہ کیا تھا۔ چھٹی کے روز گجر دم نام جھام رکھا۔ اور ہوائی محل میں جہاں پناہ کے ہاں پہونچ گئی۔ دن بھر کی چہل پہل، مردوں اور عورتوں کا غُل غپاڑہ، کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ شام کو حضور نے آ کر فرمایا۔

”زچہ کو تارے دکھاؤ“

میرے اور ننھے کے ماتھے پر کارچوبی پٹیاں جو اماں جان نے بھیجی تھیں باندھی گئیں۔ یہ پٹیاں میری بڑی نند نے خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ باندھی تھیں۔ ان کو سات اشرفیاں نیگ کی ملیں۔ دُولھا میاں کو بُلا کر چھپر کھٹ میں بٹھایا۔ اور تیر کمان ان کے ہاتھ میں دی کہ لو میاں مرگ مارو — مرزا صاحب نے ایک خالی تیر چھپر کھٹ کی چھتری پر چھوڑ دیا۔ اور میں سب کے کہنے

سے تین لاتیں چھپر کھٹ پر مار کھڑی ہوئی۔ اور باہر آ کر آسمان کو دیکھا۔ دائی نے اس وقت آٹے کی چار چومکیں بنائیں۔ ایک بڑی سی تھالی پر گندھا ہوا آٹا رکھ کر اس میں چار جگہ موم بتی رکھی۔ اور بچہ میری گود میں دیا۔ دو عورتوں نے شمع لی۔ ایک نے قرآن مجید کا سایہ کیا۔ اور دو نے تلواروں کا۔ کہ بچہ جن بھوت ہر بلا سے محفوظ رہے۔ میں تارے دیکھ رہی تھی۔ بیویاں رال اڑا رہی تھیں۔ میراسنیں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ اتفاق سے اس روز ایک انگریز قلعہ میں آیا تھا۔ وہ بھی جہاں پناہ کا مہمان ہوا۔ اور سرکار کی اجازت سے اس وقت کی تصویر اُتاری۔ ایک تصویر سرکار نے مجھ کو بھی دی تھی۔ اور وہ اب تک میرے پاس موجود ہے۔

میری نظروں میں اس وقت وہ سماں پھر رہا تھا۔ اور جی چاہتا تھا کہ دونوں بدمعاشوں کو زمین میں زندہ گاڑ دوں۔ خیر یہ بات سمجھ میں آئی کہ نرمی اور دھوکے سے کام لوں۔ تقدیر سے سپاہی بھاگوان ایسا بے خبر ہوا کہ خراٹوں کی آواز برج کے باہر جانے لگی۔ میں نے نیاز و سے کہا۔ کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب خدا انجام بخیر کرے پیاس کے مارے مر رہی ہوں دو گھونٹ پانی تو لاؤ۔"

اتنا سنتے ہی اس ناشدنی کی تو جان میں جان آئی۔ وہ پانی کو گیا اور میں برج سے باہر نکل ایک طرف کو ہو لی۔ مجھے خبر نہیں کہ کہاں اور کدھر جا رہی ہوں صبح ہوئی تو ایک پلیا کے اندر گھسی۔ اور دن وہیں بسر کیا۔ کربلا کا مزا آ گیا۔ دانہ نہ پانی دن بھی قیامت کا تھا۔ کہ ختم ہی نہ ہوا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ تو پھر جنگل کا راستہ لیا اور رات بھر جاگتی رہی۔" صبح ہوتے دکھنی پورے میں

پہونچی۔ اب مجھ میں بات کرنے کی ہمّت نہ تھی۔ خدا کی قدرت کے قربان جایئے ایک بڈھا مسلمان روٹیاں اور گڑ بانٹ رہا تھا۔ اس نے مجھ کو دو روٹیاں اور گڑ کی ڈلی دی مجھے تو امرت تھی۔ ہاتھوں ہاتھ لی۔ اور ایسی گری کہ دم بھر میں روٹیاں چٹ کیں اس کا بچہ بیمار تھا۔ مجھ کو بھوکا دیکھ کر دو اور دیں۔ وہ کھا کر خدا کا شکر اَدا کیا۔ اور اس سے کہا۔

"بابا تھوڑا سا پانی بھی پلواؤ" وہ اپنے ساتھ لے گیا اور پانی پلوا کر کہا۔

"یہ بچہ بیمار ہے اس کے واسطے دعا کر"

اے مولا نثار ہو جاؤں، مجھ ناچیز بندی کی دُعا کیا۔ مگر اس نے ایسی سُنی کہ بچہ رات ہی کو اٹھ بیٹھا۔ اب تو میری وہ آؤ بھگت ہوئی کہ کیا کہوں سارا گھر پُوجنے لگا۔ جانے کا نام لیتی جب ہی بڈھا اور اس کی بیوی روتے بچے بھی مجھ سے ایسے ہلے کہ دم کو پیچھا نہ چھوڑتے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرا بھی دل لگ گیا جب حضور کے رنگون جانے کی خبر سُنی تو میری ہچکی بندھ گئی ـــ اور آنے کا ارادہ کیا تو بڈھے نے خود یہاں تک پہونچایا۔ یہاں آ کر سُنا کہ اس نامراد نیازو کی نعش کٹ رہی ہے اور پیٹھ میں دم اٹکا ہے میں بھی اس کے ہاں گئی۔ ناہنجار کی ایک چیخ آسمان تھی اور ایک زمین۔ شاید دس گیارہ روز اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

وہ وقت گذر گیا اور یہ وقت بھی گذر جائے گا۔ مگر اب بھی اس بُرج والے نکاح کا خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ "نیازو بدمعاش کی بوٹیاں چبا لوں"

قیصر جہاں بیگم کی داستان ختم ہوئی۔ تو آدھی رات ختم ہو چکی تھی۔ نیاز و مخبر پر چاروں طرف سے لعنت کے نعرے پڑنے لگے۔ آخر گوہر آرا بیگم نے کہا۔ "بیویوں اب وہ مر گیا۔ اب اُس کو بُرا کہنے سے کیا فائدہ اس نے جیسی کی بُھگت رہا ہوگا۔

جب مجمع خاموش ہو گیا تو پھر وہی صدا گونجی ‘‘

’’ لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی ‘‘

بیگم کی سُریلی آواز نے دلوں کی کلفت زائل کر دی۔ ادھر پھولوں کی مہک اُدھر پھول بیگم کا نغمہ آدھی رات کا وقت سناٹے کے عالم میں دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔ صاحب بزم یعنی گوہر آرا بیگم نے اپنی چچازاد بہن برجیس دولہن کے سامنے شمع رکھی اور کہا۔

"بیگم اب مجلس آپ کی داستان سننے کی مشتاق ہے۔ آپ جہاں پناہ کو سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ اور حضور اپنی آنکھ سے دم بھر کو اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ آپ اپنی بپتا سنائیے۔"

شہزادی برجیس دُلہن کی سرگذشت

برجیس دولہن نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

’’ بیویوں حضور بہادر شاہ بادشاہ ہم سے جُدا ہو گئے۔ اور سات سمندر پار دُنیا سے رخصت ہوئے ہم کو آخری دیدار نصیب نہ ہوا۔ زندگی کے جو تھوڑے

دن باقی ہیں۔ وہ اسی حسرت میں کٹ جائیں گے۔ سب سے پہلے حضور کی مغفرت کے لئے ہاتھ اُٹھاؤ۔"

برجبیں دولہن کی زبان سے ادھر حضور کا نام نکلا اُدھر آنکھ سے آنسو نکلے اور ان کے ساتھ ہی مجمع پر رقّت طاری ہو گئی۔ عورتیں اور مرد سب اپنے بادشاہ کی یاد میں رو رہے تھے۔

جب دعا ختم ہو چکی تو گوہر آرا بیگم کے تقاضے پر برجبیں دُولہن نے اپنی داستان سُنائی اور کہا۔ "جب گولیوں کی باڑھ اور پھانسیوں کی قطار کا زور ہو رہا تھا۔ تو گھر میں ہم صرف دو میاں بیوی ہی تھے۔ اور کوئی اتنا نہ تھا کہ دوائی ٹھنڈائی تو درکنار دو گھونٹ پانی ہی لا دے۔ پکڑا دھکڑی کا یہ عالم کہ جو باہر نکلا پھر نہ پلٹا صبح کو گیا پھر دو پہر کو نکلا تو شام کو پھانسی کی خبر آ گئی۔ ہماری گلی میں کھاری پانی کا کنواں تھا۔ رات کو میں چُپکے سے جاگی۔ اور دو لوٹے بھر لائی۔ خدا بھلا کرے بے چارے احمد عطّار کا اس نے مجھ کو خاکسیر اور عُنّاب کے شربت کی ایک بوتل دیدی تھی۔ دونوں وقت بیمار کو وہی پلا دیتی دُوسرے تیسرے وقت خالہ کُبریٰ کچھ چنے دیدیتیں وہی کھا کر پانی پی لیتی۔ مہینہ سوا مہینہ اسی طرح گزرا۔ مگر ننھے دُولھا کا بُخار نہ اُترا۔ صبح کو ہلکا ہو جاتا مگر دو پہر سے پہلے اور چڑھتا۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں مزاج ایسا چڑ چڑا ہو گیا تھا۔ کہ بات بات پر بگڑتے تھے۔ میرا محلہ "خانم کے بازار" سے ملا ہوا تھا۔ اور ابھی تک اللہ کا فضل تھا۔ کہ حکیم باقر کے داماد نے ایک دن نشہ میں کسی گورے کی ٹوپی اُچھالی اور اس کی میم کو پکڑ لیا اب کیا تھا شام

تک تو چاروں طرف گورے ہی گورے تھے۔ گھروں میں گھس گھس کر مردوں کو پکڑا۔ اور مارا لیکن آدھی رات کو جا کر امی جمی ہوئی۔ میں کنڈی لگائے جانماز پر اللہ اللہ کر رہی تھی۔ ادر ست ہی ست پر جان تھی۔ پچھلا پہر ہوگا۔ کہ خالہ کبریٰ نے آواز دی میں نے دروازہ کھولا وہ اندر آئیں۔ اور کہا۔

”جس طرح ہو ابھی یہاں سے بھاگو صبح کو سارا محلہ توپ سے اُڑے گا۔“ میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اور کہا ”بھلا خالہ میں کس طرح بھاگ سکتی ہوں ننھے دُولھا کو کیوں کر لوں یہ نہ چل سکتے ہیں۔ نہ اُٹھ سکتے ہیں۔ ان میں رکھا ہی کیا ہے ہڈیاں ہی رہ گئیں ہیں“ وہ بولیں ”دیر کا موقعہ نہیں جس طرح ہو اُٹھاؤ۔ سب پکڑ کر لے چلیں گے۔“

میں تو جانوں تین بجے ہوں گے۔ کہ ہم سب بھرا گھر چھوڑ چھاڑ شہر سے نکلے بیمار کو ڈنڈا ڈولی کیا۔ اور ایک طرف کو چلے۔ صبح ہم کو ”نظام الدین“ میں ہوئی۔ مگر آگے بڑھے گئے۔ دن بھر کیا گذری رستہ کس طرح کٹا اللہ ہی بہتر جانتا ہے کھیل کا دانہ بھی اُڑ کر منہ میں نہ گیا۔ پیاس کے مارے جان نکلی جاتی تھی۔ مگر پانی کا بھی پتہ نہ تھا۔ کنویں تھے مگر رسی تھی نہ ڈول شام کو خواجہ صاحب کے قریب ہم ایک گاؤں میں پہونچے۔ پنہاریاں ایک کنویں پہ پانی بھر رہی تھیں۔ وہاں ٹھہر کر پانی پیا اور بیمار کو بھی پانی پلایا۔ چاند نکل آیا تھا اور ہم بڑ کے نیچے پڑے تھے کہ جاٹ آئے اور دونوں مردوں کو پکڑ لے گئے۔ میں اور خالہ کبریٰ رہ گئے۔ سوچ رہے تھے کہ کیا کریں اتنے میں دونوں مرد خالہ کے میاں اور لڑکا خوش خوش آئے خشکے کا بھرا ہوا تھال شکر اور دہی پڑا

ہوا ان کے پاس تھا۔ دیکھ کر جان میں جان آئی۔ اور اس بُری طرح ٹوٹے کہ کنگلوں کو بھی مات کیا رات ہم نے وہیں گذاری اور صبح ہم پانچوں آگے بڑھے۔

دوپہر تک تو ہم راستہ پر چلے بیمار کی وجہ سے آگے نہ چلا گیا۔ باری باری کر کے تھوڑی تھوڑی دُور سب لے جا رہے تھے۔ دُھوپ تیز ہو گئی تو ہمارے تھکنے سے پہلے ہی بیمار کی حالت ردّی ہو گئی۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور سانس نام کو رہ گیا۔ خالہ کبریٰ نے دیکھ کر کہا "ارے خدا کے لئے ٹھہرو ذرا ننھے دُولھا کو تو دیکھو کیا ہو رہا ہے" میں آگے تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے کلیجہ میں گھونسا مارا جان نکل گئی۔ مُڑی تو کیا دیکھتی ہوں منکا تک ڈھل گیا ہے! بڑ کے کمبخت درخت کے نیچے جہاں کانٹے ہی کانٹے پڑے تھے۔ ٹھیرے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے زمین صاف کی۔ ان کو لٹایا۔ دوپٹوں سے پنکھے جھلے تو خالہ نے کہا۔ کہ پٹیریاں بندھی ہوئی ہیں۔ دو گھونٹ پانی کے ہوں۔ تو حلق تر ہو جائے۔ شاید آنکھ کھولیں۔ مگر وہاں پانی کہاں میں تو خدا کی قدرت کی اسی دن قائل ہو گئی۔ کہ عمر بھر یاد رکھوں گی۔ رو رو کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کہ سامنے سے دو گورے کندھوں پر بندوق رکھے آتے دکھائی دیئے۔ ہم سب کی رُوح فنا ہو گئی۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کلمہ درود پڑھنے لگے۔ کہ اب یہ گولی مار دیں گے۔ وضو بھی نصیب نہ ہوا چھپنے کی کہیں جگہ نہیں بچنے کا موقعہ نہیں۔ کھڑے کانپ رہے تھے۔ کہ گورے سر پر آ پہونچے پُوچھا ہرن ہرن ہرن آیا ہرن آیا۔ خالہ کبریٰ نے ہمّت کی اور کہا۔

"نہیں صاحب ہم نے نہیں دیکھا"

یہ سُن کر انھوں نے بیمار کو دیکھا اور پانی کی چھاگل دیتے ہوئے کہا "پانی پانی پانی۔۔۔۔" ہم لرزتے رہے۔ اور دونوں گورے پانی دیکر چلتے ہوئے۔ ہم نے جس طرح ہُوا چلّو میں پانی لے کر بیمار کے حلق میں ٹپکایا اور اس نے ذرا آنکھ کھولی۔ تو جان میں جان آگئی خدا اپنی قدرت کے کیا کرشمے دکھاتا ہے — ملکُ الموت کو رحمت کا فرشتہ بنا دیا۔ بھوک کے مارے ہم بلبلا رہے تھے کہ ہمارے سامنے ایک زخمی ہرن لنگڑاتا ہوا آیا۔ اور گر پڑا۔ خالہ نے اسے پکڑ لیا۔ سامنے سے گڈریا بکریاں چراتا آیا۔ اور کہنے لگا "یہ زخمی ہے مر جائے گا۔ لاؤ ذبح کر دوں" ہم نے پوچھا تو مسلمان ہے؟" اس نے کلمہ پڑھا۔ ہم نے کہا بِسمِ اللّٰہ اس نے چاقو نکال کر ذبح کیا۔ ہم کو خبر تھی نہیں سامنے ہی گاؤں تھا۔ بھاگا ہوا گیا اور سب چیزیں لے آیا۔ اسی نے کھال اُتاری۔ اسی نے آگ جلائی۔ اسی نے ہنڈیا دی۔ وہ ہمارا مہمان ہوا۔ اور ہم اس کے مہمان ہوئے۔ سب نے مل کر خوب کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ گڈریئے کا یہ لڑکا اٹھارہ بیس برس کا ہو گا۔ گاؤں کا رہنے والا جس کو شہر کی آب و ہوا چھُو تک نہ گئی کیسا نیک اور شریف کہ قلعہ کے ایک لڑکے کو یہ بات نصیب نہ تھی۔ ہم کھا چکے تو چار گھڑی دن باقی تھا۔ ارادہ کیا کہ آگے بڑھیں۔ مگر اس نے نہ جانے دیا، مجھے اس کے بھولپن پر بہت بہت ہنسی آئی کہنے لگا "میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ ہم دو ماں بیٹے اس میں رہتے ہیں۔ تم لوگ رات کو مزے سے سوئیں میں بھی رہوں گا۔" شام کو وہ اپنی ماں کو بھی لے آیا اور دو گھڑے پانی بھر دیئے۔ ایسی محبت کے لوگ میں نے عمر بھر نہیں دیکھے جب ہم جانیکا نام لیتے وہ لڑکا منہ بنا کر کھڑا ہو جاتا۔ اور کہتا۔

مکئی اور باجرہ خدا کا دیا بہت ہے یہیں رہو اور کھاؤ۔ اللہ سب مشکل آسان کرے گا۔"

میرے میاں ننھے دُولھا جن کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ بچنے کی اُمید کیا گھڑی ساعت پر تھے۔ بغیر دوائی ٹھنڈائی کے ایسے اچھے ہوئے کہ اچنبا ہو گیا بخار اُتر گیا۔ اور جنگل کی ہوا اور پانی نے وہ طاقت دی کہ سب دَنگ رہ گئے۔

بے چارے لڑکے نے ہمارے واسطے نہر کے کنارے ایک جھونپڑی ڈال دی وہ دونوں ماں بیٹے بھی وہیں آ گئے۔ یہاں چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ کوئی سات آٹھ نیم کے درخت تھے۔ اور دو تین املی اور جامن کے، ہم یہاں خوش تھے۔ مگر ایک بات کا مجھ پر بڑا بوجھ تھا کہ اس غریب سے رشتہ نہ ناتا مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ خالہ نے ایک دن اس سے کہا کہ تم مجھ کو تھوڑا ریشم اور ایک کرتہ کی ململ لا دو۔ وہ جا کر لے آیا۔ تو انھوں نے تین چار ہی دن میں ایسا کاڑھا کہ وہ تو وہ جس نے دیکھا وہی تعریف کرنے لگا۔ اب تو یہ کیفیت ہوئی کہ چاروں طرف سے لوگ آنے لگے۔ اور ہماری کڑھائی کی دُور دُور خبر پہنچ گئی۔ لڑکے نے خرچ لینے سے انکار کر دیا۔ تو ہم نے یہ ترکیب کی کہ اس کا کپڑا مفت کاڑھ دیتے تھے اور وہ اس کو بیچ لاتا تو دام نہ لیتے تھے۔ اس طرح اس کا خرچ بھی پورا ہوتا۔ اور ہمارا بھی۔

اب ہماری گذران خوب ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ شہر یہاں سے بیس ٢٠ اکیس ٢١ کوس ہے اور امی جمی بھی ہو گئی ہے۔ مگر دل کچھ ایسے مر گئے تھے۔ کہ جلنے

کو جی نہ چاہتا تھا۔ دم بدم کی خبریں آتے جاتوں سے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جس کو پوچھا یہ ہی پتہ چلا کہ پھانسی ہو گئی۔ یا بھاگ گیا۔ چچا حشمت میں جان پڑی تھی۔ گئی آدمیوں سے کہا۔ کہ ان کی خبر لاؤ۔ مگر کسی کو گھر نہ ملا۔ آخر ایک دن ننھے دولھا ہی دل کو کڑا کر کے پہونچے اُپلوں کی گاڑیاں شہر جا رہی تھیں۔ اور ان کا چودھری لڑکے کا پھوپا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ اور دو بجے سے یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ کہ نو دس بجے تک شہر پر پہونچ جائیں گے۔ اور سویرے ہی سویرے بیچ کھوچ بارہ ایک بجے چل کھڑے ہوں گے۔ رات کو کہیں گیارہ بجے گاڑیاں لوٹیں تو ننھے دولھا نے کہا۔ شہر تو آدھے سے زیادہ کھُد گیا۔ گھروں کا پتہ ہے نہ گھر والوں کا چچا حشمت کا گھر تو باقی ہے۔ مگر ان کا پتہ نہیں۔ برابر میں ایک روئی والا رہتا ہے اس سے اتنا معلوم ہوا کہ بال بچوں کو لے کر کہیں نکل گئے۔ اب تک خبر نہیں کہ جیتے ہیں یا مر گئے۔ ہاں ایک مخبر نے یہ بھی کہا کہ ان کے چھوٹے لڑکے کو تو پھانسی ہو گئی۔"

وہ تو میری گودیوں کا کھیلا ہوا تھا۔ سنتے ہی جان نکل گئی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ شہر جانے کا اوّل تو ارادہ ہی نہ تھا۔ اور اگر تھوڑا بہت خیال کبھی بھولے بسرے آ بھی جاتا تھا۔ تو اب بالکل نفرت ہو گئی۔

برجیس دولہن اپنی داستان یہاں تک پہونچا کر پان کھانے کے واسطے اٹھیں تو گوہری تمبو میں بیگم کی وہی صدا گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

اتنا کہہ کر بیگم نے چھیبوں سے کپڑے اُٹھائے۔ تو تمبو خوشبو سے مہک

اٹھا۔۔ گوہر آرا بیگم نے کہا پہلے درُود پڑھو پھر حضوُر کی مغفرت کے واسطے دعا کرو۔"

اس وقت تین بج چکے تھے۔ اور چاند خواتین مُغلیہ کی بربادیٔ نامُوس پر ماتم کرتا ہُوا بساط فلک سے لپیٹ لپیٹ کر رُخصت ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں نے اس کے بعد بڑی بڑی مجلسیں دیکھیں۔ اور کانوں نے اچھی اچھی تقریریں سُنیں۔ مگر جبیں دُلہن کا نالہ سرزمین شاہجہاں آباد پر اس درد سے گونجا کہ اس کی کسک اب تک دل میں موجُود ہے زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھیں۔ اور ماتم کئے۔ مگر بیلہ میں میلہ دیکھ لیا۔ اب وہ سماں نظر نہ آئے گا۔ بدبخت شہزادیوں کی بپتا سفید داڑھیوں پر آنسوؤں کے موتی لُٹا کر خانماں برباد بیبیوں کی داستان جوانوں کے کلیجے توڑ رہی تھی جس طرح موسم برسات میں پُوروا ہوا کے ساتھ جسم کی پُرانی چوٹیں ابھرتی ہیں۔ اسی طرح جب بیلہ میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ رات اور وہ صُورتیں آنکھ کے سامنے آجاتی ہیں بیلے والے خوش نصیب تھے کہ اپنے ساتھ بیلے کو بھی لے گئے۔ اور آج اس کے گھندار درختوں اور جھاڑیوں کا جن کے دامن شہری آبادی کی تاریخ سے مالامال تھے۔ ایک ذرہ بھی موجُود نہیں جو صحبت شب کا نشان دے اور حق یہ ہے کہ مکیں اور مکاں سب فنا ہُوئے اور مجھے تو کوئی صورت بھی اب ایسی نظر نہیں آتی جس نے اس بزم کی شمع جھلملاتی دیکھ لی ہو۔

بیلے میں میلے کی آخری یادگار پھول والی بیگم" اس کے بعد بیس[٢٠] سال

کے قریب زندہ رہی۔ کمر جھک گئی۔ اور دانت بھی ٹوٹ چکے تھے۔ مگر "بڑیوں کے کٹڑہ" میں جن دو کانوں کے پاس شاید اب ڈاک خانہ ہے۔ اس کی آواز نے رات کے سناٹے میں مُدتوں کہرام مچایا ہے۔ میں اور میرے عزیز دوست شہزادہ محمد اشرف صاحب بی' اے گورگانی بیگم کے مرض الموت میں عیادت کو گئے تھے۔ کہ شاہان مُغلیہ کی اس جیتی جاگتی تصویر کو آخری مرتبہ جی بھر کر دیکھ لیں۔ اس رات کے ذکر پر بیگم کے آنسو نکل پڑے۔ آج بیگم اور مرزا دونوں شاہجہاں آباد سے کیا اس دُنیا سے رُخصت ہو چکے۔ مگر بیگم کی زندگی اب بھی جب میلے میں جاتا ہوں وہ اُجڑا ہوا سماں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ پھُولوں کی مہک نے اور بیگم کی لہکار نے کہ

"لپٹیں آ رہی ہیں مونیا کی"

برجبیں دُولہن کی بپتا کو فراموش کر دیا۔ جب دعا ہو چکی تو چار بج رہے تھے۔ بادشاہ کا نام آتے ہی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔ برجبیں دُلہن کی داستان ابھی ختم نہ ہوئی تھی اور خیال تھا کہ وہ نماز سے پہلے اپنی مصیبت سُنا دیں گی لیکن گوہر آرا بیگم نے کہا۔

"میں جانتی ہوں دِلّی والوں کو یہ راتیں پھر نصیب نہ ہوں گی۔ اور جی نہ چاہتا ہوگا کہ جلسہ ختم ہو۔ مگر زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر رات اور سمجھ لو۔ برجبیں دولہن تھک گئی ہیں۔ اِس لئے اب باقی کنتھا رات کو۔"

تجّن صاحب کے احاطہ والے خلیفہ رحیم بخش تیراک جن کے بیٹے شبّی

اب بھی زندہ ہیں۔ اسی صبح کو جمنا میں ڈوب کر مرے۔ ان کی بابت سُنا ہے کہ وہ پالتی لگا کر اس پار سے اُس پار حُقہ پیتے نکل جاتے تھے۔ ان کے ڈوبنے کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ مگر نے ان کا خاتمہ کیا۔

بسنت کا اصلی میلہ تو ایک دن کا تھا۔ دلّی والوں نے اپنی دھینگا دھینگی سے دِن بڑھالئے تھے۔ خلیفہ جی کی موت سے میلہ کچھ اُکھڑ سا گیا۔ "قاضی کے حوض" سے لے کر ادھر "نئے بانس تک۔ اور اُدھر پھاٹک نہر موری دروازہ تک "بھوری والوں" نے دو کانیں کھولیں۔ ہاں خوجی والے چرخی والے" اور شیفو والے" میلہ نہاتے رہے۔ مگر آج روز کی سی گھما گھمی نہ تھی۔ لیکن شام ہوتے ہی خلقت ٹوٹ پڑی۔ "گوہری ممبو" اور میدان آدمیوں سے پٹ گیا۔

شہزادیاں قلعہ میں پہلے ہی پردہ نہ کرتی تھیں۔ اب غدر نے پردہ کا بالکل ہی صفایا کر دیا تھا۔ عشاء کی نماز نگم بود دروازے" ہوئی۔ اور دس بجے ہوں گے۔ کہ بیگم کی آواز گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

ٹھیک تعداد تو یاد نہیں۔ مگر پھولوں کے چھیبے پندرہ بیس سے کم نہ ہوں گے۔ وہ آج کل کے دن نہ تھے کہ ہر چیز پر آگ پڑ رہی تھی پیسے پیسے کی ڈھیریاں الگ لگی ہوئی تھیں۔ دو گھنٹے میں دو کے سوا سب چھیبے خالی ہو گئے تو بیگم کی آواز پھر گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

گوہر آرا بیگم نے مسکرا کر کہا۔

بس بیگم اب بیان شروع کرو اور یہ تبرک رکھ لو“ اتنا سنتے ہی بیگم نے چھپیے ڈھانک دیئے۔ برجیس دولہن آکر بیٹھیں اور کہا:“

میں تو کل کہہ چکی ہوں کہ حسنو میاں کی پھانسی کی خبر سے میرا دل زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس بچہ کو میں نے اپنے ہاتھ سے پالا تھا۔ بہتیرا بہلاتی تھی مگر دل کسی طرح ٹھیک ہی نہ ہوتا تھا۔ آخر میں نے ننھے دولہا سے کہا کہ میرا جی یہاں سے گھبراتا ہے۔ اب یا تو شہر چلو یا جدھر منہ اٹھے“۔ وہ راضی ہو گئے۔ اور ہم نے جانے کا ارادہ کیا تو امرو اور اس کا سارا گھر منتیں کرنے لگا۔ مگر میرا دل اکھڑ گیا تھا۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ میرٹھ یہاں سے تیس کوس ہے۔ وہاں چلیں۔ میری ایک رشتہ کی پھوپی وہاں تھیں اور مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھیں۔ ٹھہرنے کا ٹھکانہ موجود تھا۔ چالیس پچاس روپے بھی پاس ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کو روتا چھوڑ آخر میں اور ننھے دولہا میرٹھ روانہ ہو گئے۔ گاڑی والا تو بڈھا مگر مزاج کا بہت ہی کڑوا۔ ہم صبح ہی چلے تھے۔ شام کو بیگم آباد میں قیام کیا۔ ایک ٹوٹی ہوئی سرا میں ٹھہرے۔ رات گذری۔ کھانا ہمارے ساتھ تھا۔ صبح اٹھ کر آگے بڑھے اور چار بجے میرٹھ پہونچ گئے۔ پھوپی جان کو بہتیرا ہی ڈھونڈا خاک پتہ نہ چلا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ غدر میں دونوں میاں بیوی دلّی جا کر مر گئے۔ اب اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا کہ یہاں بھی سرا میں گئے بھٹیاری ایسی خردماغ کہ اللہ کی پناہ۔ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑے۔ ہر وقت یہ کہتی تھی کہ تم مخبر ہو ہم کو وہاں ٹھہرے چوتھا روز تھا کہ ننھے دولہا بخار میں لوتھ ہو گئے میرٹھ میں خاصی امی جمی ہو گئی تھی۔ حکیم کا نسخہ تھا اس نے کہا۔ موتی جھرا ہے۔“

آٹھواں یا نواں دن تھا۔ کہ ان کی حالت بگڑنی شروع ہو گئی۔ گھس لگانے کو آدمی نہیں۔ آخر میں ہی باہر نکلی۔ اور برقعہ اوڑھ حکیم جی کے ہاں پہونچی۔ انھوں نے اِنسانیت برتی کہ میرے ساتھ آ گئے اور نبض دیکھ کر نسخہ بدلا مجھ سے تو یہ کہا کہ گھبراؤ نہیں اللہ مالک ہے۔ اور بھٹیاری سے کہہ دیا یہ مرجائیں گے ہوشیار رہنا" وہ نامراد آئے تو جائے کہاں نتھنے پھلائے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کہ کوٹھری ابھی خالی کرو۔" بیمار کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں نے بہتیرا سمجھایا مِنّت خوشامد کی — لیکن کمبخت کیا ماننے والی تھی۔ اپنے دو اور بھٹیاروں کو لے آئی۔ کہ ہماری سرا بدنام ہو گی۔ نوج اس میں سے مُردہ نکلے میں روتی ہوئی سڑک پر جا بیٹھی دو تین مرد میرے ساتھ آئے اور ان بے ایمانوں کو ڈانٹا بیمار کو دیکھا سانس اُکھڑ رہا تھا وہ اتنے بھلے مانس تھے کہ وہیں بیٹھ گئے۔ شہد لائے یٰسین سُنائی رات کے تین بجے ہوں گے کہ ننھے دُولھا رخصت ہوئے۔

میرٹھ کے یہ تینوں آدمی فرشتہ تھے جن کو خدا نے بھیجا تھا۔ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ انھوں نے ہی اوّل منزل کیا۔ اور ہمارا کرایہ بھی ادا کیا۔ میں ٹھیک دوپہر کو باہر نکلی۔ تین پیسے میرے پاس تھے۔ کہاں جاتی۔ اور کہاں پڑتی۔ ایک پیسے کے چنے چبائے اور رات کو "مدار دروازہ" کی سڑک پر بیٹھ کر صبح کر دی۔ یہ دن اور رات بھی یُونہی گذری۔ اور وہ دو پیسے بھی ختم ہو گئے۔ مجھ پر دو وقت کا فاقہ تھا مگر بھیک مانگنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ایک پختہ حویلی دکھائی دی بسم اللہ کہہ اندر داخل ہوئی اور گھر والی بی بی سے کہا "آپ کو ماما کی ضرورت ہے؟" وہ تو ایسی نکتوڑی تھی کہ جواب بھی نہ دیا۔ ہاں میاں

نے کہا۔ کہ اندر آؤ بی کون ہو" کہاں کی رہنے والی ہو۔ کیا تنخواہ لوگی۔ میں نے کہا "جو آپ دیں گے"۔ اس پر میاں بیوی میں کچھ صلاح ہوئی۔ اور مجھ کو ایک روپیہ مہینہ کھانے پر نوکر رکھ لیا۔

میاں جس قدر شریف تھے بیوی اسی قدر کمینی۔ کمبخت کی سمجھ میں کوئی کام ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے تین چار مہینے کاٹے ایک دن مرچوں پر جھگڑا ہوا کہنے لگی "تم نے مرچیں زیادہ کر دیں۔ میں نے کہا نیک بخت ! نوکری طے کر رکھ ہاتھ نیچے ہیں ذات نہیں بیچی"۔ میں اتنا کہہ برقعہ اوڑھ باہر نکلی۔ پیچھے پیچھے میاں آئے۔ بہتیری منت خوشامد کی۔ مگر میرا دل اکھڑ گیا تھا۔ میں وہاں نہ ٹھہری۔ دو روپے میرے پاس تھے۔ ایک روپیہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ نہ ملا۔ تو آنے اونٹ گاڑی کا کرایہ دے کر دہلی آ گئی۔

اب زندگی کا مزہ نہیں ہے۔ ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہوں جہاں سب گئے خدا مجھے بھی وہیں پہنچا دے" اور میرا پردہ ڈھانک لے۔

میری وہ راتیں جو بیلے میں بسر ہوئیں زندگی کی بہترین راتیں تھیں۔ شہزادیاں بھی قلعے اور بادشاہ کو اتنا نہ روئی ہوں گی جتنا میں دلّی اور دلّی والوں کو رو رہا ہوں۔ عمر گذشتہ کی یاد بڑھاپے میں سوہان روح ہوتی ہے۔ کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور جب جوانی کی بہاریں سامنے آتی ہیں۔ تو گذرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی راتیں تیر بن کر دل میں گھستی ہیں۔ مگر جس کی جوانی بھی بڑھاپے سے بدتر ہو۔ جو پیدا ہوا تو روتا ہوا۔ اور زندہ رہا تو روتا ہوا جس

کے قہقہے بھی آنسوؤں میں شرابور۔ اور جس کی مسرت بھی افکار سے لبریز۔ وہ روئے تو اپنے آنسوؤں پر، بلبلائے گا تو اپنے آلام پر، زندگی کا وہ فانی دَور جو جوانی کے نام سے تعبیر ہوتا ہے مجھ پر بھی گذر رہا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اس اصول سے میں بھی مُستثنیٰ نہیں ہوں۔ مگر جوانی جب یاد آتی ہے اُس کے پہلو میں ہمیشہ بگڑی ہُوئی صورتیں دیکھی ہیں دلّی اور دلّی والے بیلے کے میلے میں جن گھروں کو رو رہے تھے۔ وہ تو خیر رُخصت ہو ہی چکے تھے۔ ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے سب اُٹھ گئے میں ان راتوں میں رونے والوں کا ہمنوا تھا۔ آج تنہا ہوں اور کوئی اتنا بھی نہیں جو میرے آنسوؤں کی ہاں میں ہاں ملا دے۔

جی تو یہی چاہتا ہے کہ "پھول والی بیگم" کی لہکار اور مہکار ہر جگہ کانوں میں گونج رہی اور دماغ میں بس رہی ہے۔ جب تک زندہ ہوں عقیدت کے پھول چڑھاتا رہوں۔ مگر سُننے والے اُکتا جائیں گے۔ اس لئے چھوڑتا ہوں۔ اور اصل مقصد پر رجُوع کرتا ہوں۔

بر جبیں دولہن کی داستان ختم ہوئی تو پھر وہی صدا گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں مونیا کی"

خلقت پھر ٹوٹی جو ڈھیریاں باقی رہ گئیں تھیں۔ وہ ختم ہو گئیں۔ تو گوہر آرا بیگم نے کہا

مینا بازار

"بر جبیں دولہن کی داستان ادھوری رہ گئی تھی۔ اس لئے پہلے وہ ختم

ہو گی۔ بادشاہ کے لئے دعا ہو چکی۔ مگر دلّی والوں! بادشاہ کہاں! بلبل اُڑ گئی خالی پنجرے کو پیٹ لو۔ رُوح نکل گئی جسم باقی ہے۔ تم نے صاحب عالم کا بگڑا ہُوا وقت دیکھا جن باتوں کو رو رہی ہوں یہ زوال کے دن تھے۔ ہم خوش نصیب ہیں۔ کہ ہم نے اچھے دن دیکھ لئے۔ قلعہ میں مینا بازار کی سیر ایسی دیکھی کہ اب تم کو نظر نہ آئے گی۔

چھتیسویں کال کی وجہ یہ ہے جب آٹا ڈیڑھ من کا چھتیس سیر کا رہ گیا مخلُوق چیخ اُٹھی اور کہہ دیا کال پڑ گیا۔ حضُور نے حکم دیا کہ مینا بازار کی ساری آمدنی کنگلوں کو دے دو۔ بات فقط اتنی تھی کہ ساون کے تیرہ دن نکل گئے۔ اور مینہ نہ برسا۔ آدھا اساڑھ خاصا برسا تھا مگر بنیوں نے تیرہ ہی دن کو تیرہ برس بنا آٹا گھٹا دیا۔ یہ بادشاہ اور رعیت کے راز و نیاز ہیں۔ چھتیس سیر کا آٹا ہوتے ہی رعیت نے چھتیسا کال اس کا نام رکھ دیا۔ اور حضور نے مینا بازار کی پُوری آمدنی کنگلوں کی نذر کر دی۔ کوئی ولیم صاحب انگریز بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جگہ جگہ کی تصویریں بھی اُتار لیں۔ مینا بازار کی تصویر مجھے بھی صبح کو کوٹھری میں پڑی مل گئی۔ سُنتی ہوں اب ولایت میں اس کی بڑی قدر ہو رہی ہے۔“

تصویر کا نام سُنتے ہی لوگ گرنے شروع ہو گئے۔ لیکن گھنٹہ بھر سے زیادہ ہو گیا تو گوہر آرا بیگم نے ایک ہاتھ میں شمع لی اور دوسرے میں تصویر لے کر کہا ”دُور سے نیت بھر کر دیکھئے۔ یہ مینا بازار کی تصویر ہے۔ آگے چل کر مینا بازار تو کیا تصویر بھی دیکھنی نصیب نہ ہو گی۔ یہ وہ تصویر ہے کہ حضُور کی منجھلی بیوی افروز دُولہن سر پر تاج رکھے موتیوں کا ہار خرید رہی ہیں۔ اور عورتیں

ان کو مال دکھا کر منہ مانگے دام لے رہی ہیں۔“

جب سب لوگ تصویر دیکھ چکے تو گوہر آرا بیگم نے کہا۔ اب ہماری ننھی حیدری اپنی داستان سُنائیں گی۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھان لی۔“

بی ننھی حیدری مسکرا رہی تھیں کہ پھر آواز گونجی۔

”لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی“

گوہر آرا بیگم نے کہا۔ اے ہے بیگم بس کرو۔“ دیکھو تو آدھی سے زیادہ رات تو باتوں ہی باتوں میں گذر گئی خلقت بے چین ہو رہی ہے۔ بیگم نے قہقہہ مارا اور کہا۔ آپا پھول تو ختم ہو گئے اب رکھا ہی کیا ہے۔ میں تو ہنس رہی ہوں۔“ اس پر سب ہنس پڑے اور ننھی حیدری نے اپنی بیتی اس طرح سُنائی۔

ننھی حیدری کی آپ بیتی

میرے گھر میں سوائے ابا میاں کے اللہ کا نام تھا۔ باپ۔ کتنے تو وہ اور رہاں تھے وہ بہن بھائی کوئی ہوا ہی نہیں۔ نانی دادی کی صورت بھی نہ دیکھی۔ کسی بڑی ضرورت کو بھی گھر سے نکلتے تو اُدپر کی کُنڈی لگا کر جاتے۔ جب غدر کا پہاڑ گرا تو وہ بےچارے آس نہ پاس لیکن کالے مخبر نے میرے بے قصور ابا میاں کو پکڑوا دیا۔ اور اتنی سی بات پر کہ اس کے لڑکے سے اُنھوں نے میری شادی کیوں نہ کر دی مجھ پر جو کچھ گذری کیوں کر کہوں۔ اور کس سے کہوں۔ دو دن اور

دو رات جا نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہی۔ تیسرے دن صبح ہی اس نے آکر کہا۔ "تیرے باپ کو پھانسی ہو گئی۔ تو میری بھتیجی ہے اب تیرا نکاح میں اپنے لڑکے کے ساتھ کروں گا۔" اب کوئی اللہ کا بندہ بتائے کہ میں کیا کرتی! ابا میاں کی پھانسی کا، کالے بے ایمان کی بدمعاشی نکاح کا ڈر کس کس چیز کو روتی۔ یہ تیسرا دن بھی فاقہ سے گذرا تیسرے پہر کو اس نے آکر کہا۔ "آج مغرب عشاء کے درمیان تیرا نکاح ہے۔" یہ سنتے ہی جان نکل گئی۔ شام پکڑنی مشکل تھی۔ ادھر جھٹ پٹا ہوا۔ ادھر میں نے ابا میاں کی اچکن پہن صافہ باندھا۔ اور لکڑی ہاتھ میں لے باہر نکل گئی۔ ساری رات منہ اٹھائے چلتی رہی۔ پلٹ کر نہ دیکھا۔ صبح مجھے جنگل میں ہوئی۔ مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ کالا پیچھے آرہا ہے۔ پھر چلی، شاید دس بجے ہوں گے ایک گاؤں کے چوراہے پر مٹی کی چینی میں خشکہ رکھا ہوا تھا۔ ڈر خوف سب بھول گئی بڑے بڑے نوالے مار آگے بڑھی۔ پیاؤ پر پانی پیا۔ اور چل دی۔

مجھے نہ تو یہ خبر تھی کہ دن کہاں ہے نہ یہ کہ رات کدھر آئی اور گئی۔ یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ کتنے دن اور کتنی راتیں اس طرح گذریں۔ جس گاؤں میں پہنچتی بھیک سے پیٹ بھر لیتی۔ اور آگے بڑھ جاتی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ اسی طرح گذرا ہوگا۔ آخر تھک کر چور ہو گئی۔ پاؤں لہو لہان ہوئے۔ اور جب ایک دن دوپہر کے وقت بخار شدت سے چڑھا تو ایک درخت کے نیچے ٹھٹکی۔ کالے کمبخت کا ایسا ڈر سوار تھا کہ بخار میں بھی اسی مردود کی صورت سامنے آتی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے ایک پہاڑ تھا۔ وہاں گئی تو اس کے نیچے ایک کھو میں پڑ گئی۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک وہاں سوئی۔ گھنٹہ بھر۔ یا دن بھر۔ آنکھ کھلی تو بخار اتر چکا تھا۔

مگر کمزوری کا یہ حال تھا کہ بات نہ کی جاتی تھی۔ چاروں طرف دیکھا آدمی نہ آدم زاد پیاس کے مارے کانٹے زبان میں پڑ رہے تھے۔ مگر پانی کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس جنگل بیابان میں اس سنسان پہاڑ پر ایک طرف سے کچھ گانے کی سی آواز آئی۔ اسی آواز پر چل کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دُور جا کر کیا دیکھتی ہوں کہ ایک آبشار ہے اور پاس ہی ایک چشمہ صاف شفاف پانی کا لہریں لے رہا ہے۔ اِدھر اُدھر خوش رنگ پھولوں کے پودے ہیں۔ جس وقت ہَوا ان پھُولوں کو سرسراتی ہے تو ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ تمام پہاڑ ہنس رہا ہے۔ کیسی بہار تھی کہ سبحان اللہ۔ میں نے پانی پیا تو کتنا شیریں کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ پہاڑی درخت پھُولوں سے لدے کھڑے تھے۔ بھُوک کے مارے بیتاب تھی۔ خوب توڑے خوب کھائے مگر باجے گانے کی آواز اب تک برابر آ رہی تھی۔ اور اب بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ آگے بڑھی تو دُور سے ایسا معلُوم ہوا کہ وہ باجے کی آواز پُونگی ہے۔ اور کوئی شخص تنہا کبھی پُونگی بجاتا ہے۔ کبھی گاتا ہے یہاں تک کہ ایک شخص دکھائی دے گیا۔ دُور سے کھڑے ہو کر دیکھا کہ کہیں کالا نہ ہو جب دیکھ لیا کہ ایک بڈھا سپیرا ہے تو پاس پہنچ گئی۔ سپیرا اپنی بین میں مست خود ہی جھُوم رہا تھا۔ اور اس کے سامنے دو سانپ کالے بھنور پھن اٹھا اٹھا کر اس کی گود میں کھیل رہے تھے مجھے دیکھ کر سپیرے نے پُونگی چھوڑ دی۔ اور ایک سانپ کو ہاتھ میں پکڑ کر مجھ سے پوچھا " بابا کون ہے؟ کیوں آیا ہے؟ میں ایک کونے میں خاموش بیٹھ گئی۔ سپیرا میرے قریب آیا۔ بڈھا پھُوس تھا۔ پلکیں تک سفید تھیں اور تمام جسم پر جھُریاں پڑی ہوئی تھیں میں نے اس

سے تمام کیفیت بیان کی۔ وہ ایسا مہربان ہوا۔ کہ اسی وقت اپنے ہاتھ سے پھل توڑ کر کھانے کو دیئے۔ اور کہا " بیٹی یہ نیلگری پربت ہے تو شوق سے رہ میں تجھ کو اپنی بیٹی سمجھوں گا۔" اس نے مجھ سے اپنی حالت بیان کی۔ کہ راجہ سمیرپور کا بھانجہ ہے۔ ایک جوان لڑکی عمر بھر کا سرمایہ تھی۔ جس کو مرے پندرہ بیس برس ہوئے اس کی موت کے صدمہ سے گھربار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل آیا۔ اور یہاں زندگی بسر کر رہا ہے مجھے اس کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ کہ کوئی رنج و غم اس کے پاس آ کر پھٹکتا نہ تھا۔ قدرت کا دسترخوان انواع و اقسام کی نعمتوں سے ہر وقت اس کے واسطے حاضر تھا۔ اور ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے ہر لمحہ اس کی دعوت میں مصروف تھے میں بھی ہر طرح سے بے فکر تھی۔ وہ مجھ کو بیٹی سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی محبوب و مرغوب چیزیں سانپ تھے۔ ہر وقت کھیلتا اور مگن رہتا۔

ایک روز اس نے ایک بوٹی مجھ کو دکھائی۔ کہ کیسا زہریلا سانپ ہو یہ تریاق ہے اگر ایک قطرہ بھی حلق سے اتر گیا تو آدمی مر نہیں سکتا۔ کوئی دو مہینے بعد سپیرا پہاڑ سے اترتا ہوا لڑھک گیا۔ اور ایسا گرا ہڈی پسلی چکنا چور ہو گئی۔ اب میرا ٹھہرنا فضول تھا۔ اور میرا دل بھی اس کے بعد نہ لگا۔ میں یہ کہنا بھول گئی کہ میرے کپڑوں کی دھجیاں لگ گئی تھیں۔ ایک گیروا چادر سپیرے نے مجھے دیدی تھی۔ وہی میرے بدن پر تھی۔ صبح کے وقت ایک دن میں وہاں سے چل کھڑی ہوئی۔ شام کے قریب ایک شہر میں پہونچی۔ دلی چھوڑے مدتیں ہو گئیں تھیں۔ شہر کی صورت دیکھتے ہی دل کی کیفیت کچھ اور ہو گئی

اور اپنا گھر یاد آیا۔ مگر کجا دلی کجا میں۔ ٹھنڈا سانس بھر کر سڑک پر بیٹھ گئی۔ سامنے دیکھا تو آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دس جاتے ہیں اور بیس آتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا "تمہیں سانپ کے کاٹے کا منتر بھی یاد ہے"۔ میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے تو اس نے کہا۔ "ہمارے راجکمار کو ناگ نے ڈس لیا ہے"۔ میں نے کہا کدھر ہے دیکھوں"۔ بوٹی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اندر جا کر دیکھا تو بائیس چوبیس برس کا لڑکا بے ہوش پڑا ہے۔ اور سینکڑوں آدمی ادھر اُدھر کھڑے افسوس کر رہے ہیں۔ اس کی ماں پچھاڑیں کھا رہی تھیں میری صورت دیکھتے ہی قدموں میں گری اور کہا "مہاراج دیا کیجئے"۔

میں نے بُوٹی پیس کر حلق میں ڈالی۔ خدا کی شان راجکمار نے آنکھیں کھول دیں اب تو سارا شہر میرے قدموں میں تھا۔ راجکمار کی ماں کو جب معلوم ہوا کہ میں لڑکی ہوں تو اس نے مجھ کو اپنے ہاتھ سے نہلا دُھلا کر کپڑے بدلے اب راجکمار بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ میں نے چلنا چاہا تو وہ کہنے لگا "اگر تم جاتی ہو تو مجھے بھی زندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔ اسی سانپ کو بُلا کر پھر ڈسوا دو" میں نے اس سے حرف بہ حرف تمام داستان کہدی اور یہ بھی کہدیا۔ کہ دلی کو دل ترس رہا ہے...... اس کے حکم کی دیر تھی وہ اور اُس کے نوکر چاکر ساتھ ہو لئے اور اب ہم سب آج سولھواں روز ہے کہ یہاں پہونچے راجکمار ٹھرا یہیں ہے۔ تھا تو ہندو مگر اب مسلمان سمجھ لو۔ نکاح کا خواستگار ہے جو تم سب کا فیصلہ ہو تعمیل کروں"۔

ننھی حیدری کی بھی داستان ختم ہوئی۔ تو رات بھی ختم کے قریب تھی۔

گوہر آرا بیگم نے فرمایا "بیویوں آج کی رات بھی ختم ہو گئی۔ مگر ابھی داستانیں بہت باقی ہیں۔ آپ لوگ اُکتا جائیں گے۔ سچ پوچھو تو یہ داستانیں زبان پر نہیں تو دلوں میں اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک شہر زندہ ہے"۔ اب اس کو ختم کرنا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ عمریں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن داستانیں ختم نہ ہوں گی۔ دِلّی والوں پر جو خدا کا قہر ٹوٹا۔ اور مصیبت آئی وہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ مجھ سے اگر سچ سچ پوچھو تو اس میں گوروں کا قصور ہے نہ فرنگیوں کا۔ سب سے پہلے تو تلنگوں نے آفت ڈھائی کہ شہر بھی لوٹا اور میموں کو بھی مارا۔ اس کے بعد مخبروں نے جن کی جھوٹی خبروں سے سینکڑوں نہیں ہزاروں بے قصور پھانسیوں پر چڑھ گئے اور گور و کفن تک نصیب نہ ہوا۔ قیامت برپا کر دی۔ صاحب عالم کا معاملہ وہ شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ کہ ایسے بھولے بھالے ایسے سیدھے سادھے بادشاہ پر بغلی گھونسوں نے وار کیا۔ اور جس کے نمک سے پیٹ بھر رہے تھے۔ اس کو گھر سے نکال کر اپنے گھر میں گھی کے چراغ جلائے۔

یُوں تو سارا شہر ہی مصیبت کا مارا ہے۔ بس آج اور کل دو راتیں اور سہی، کل تک جن جن کی کتھا ہو جائے۔ باقی اب ختم کیجیے۔ زندگی ہے تو پھر کبھی سہی۔ اگلے برس جب بیلے میں میلہ ہوگا تو دیکھی جائے گی۔

ہم تو پھول بیگم کے قائل ہیں۔ ایک اکیلی نے سارے مخبروں اور اللہ ماروں کو ناک چنے چبوا دیئے۔ دُنیا شہر چھوڑ چھاڑ بھاگ گئی مگر یہ اسی طرح شہر میں دندناتی رہی۔ مجال نہیں جو کوئی آنکھ ملا سکتا۔ دو کوڑی کی ٹکھ لاکر کھا رہی تھی۔ آدمی ہاتھ پاؤں ہلائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح

عزت آبرو سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔

ہم شہزادیاں سچ پوچھو تو پر قینچ کبوتر تھے۔ قلعہ سے چھوٹے تو اُڑ کر کہاں جاتے جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ عمر رنگ رلیوں اور ایسے مردوں میں گذری۔ جو قید سے بدتر تھے اب جو اُڑے تو بازو میں سکت نہ پاؤں میں ہمت نیچے سے بلیوں نے دبوچا اُوپر سے باز بہریوں نے خیر اب جلسہ ختم کرو۔ زندگی بخیر ہے۔ تو کل رات کو گوری پھوپی اپنی داستان سُنائیں گی۔ ہاں بی پھول والی بیگم۔ لو اذان سے پہلے ایک صدا اور لگا لو۔ ہاں بیوی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

بیویوں میں قہقہہ لگا۔ پھول والی بیگم بھی ہنسنے لگیں اور سب اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے مغرب کے بعد ہی گوہر آرا بیگم آ موجود ہوئیں۔ دس گیارہ بجے رات تک کچہریاں سی لگتی رہیں آدھی رات کا عمل تھا کہ بیگم کی آواز گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

برجیس دولہن برابر بیٹھی تھیں بیگم کی آواز جو ان کے برابر گونجی تو چونک پڑیں اور کہنے لگیں۔

"اے ہے خالہ ٹیکی پڑے موئی لپٹوں کو میرے تو پردے بھی پھٹ گئے"۔

گوہر آرا بیگم نے کہا۔ "اچھا بی خالہ! لو جلدی جلدی چھبیے خالی کر لو۔ خلقت ٹوٹ پڑی اور ایک آدھ ہی گھنٹہ میں پھول صاف ہو گئے — تو گوہر آرا بیگم نے کہا۔

"اب سب سے پہلے گوری پھوپی جان" اپنی بیتی سُنائیں گی۔ اتنا کہہ کر انھوں نے گوری کا ہاتھ پکڑ کر سامنے بٹھایا تو وہ ہنس کر کہنے لگیں۔

شہزادی قمر جہاں بیگم کی بپتا

سب نے اب تک آپ بیتی سنائی میں جگ بیتی سُناتی ہوں اور یہ ایسی ہے سُننے والوں کے رُونگٹے کھڑے ہو جائیں گے مجھ کو شہر آئے دو سال سے زیادہ ہوئے۔ میں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ آج سب کے سامنے بیان کرتی ہوں۔

مجھ پر ایسی بپتا نہیں پڑی جس کا رونا روؤں میں نے بارہ دری والی چچی کی لڑکی قمر جہاں کی جو بپتا دیکھی وہ خدا دشمن کو نہ دکھائے میرے آکا ابا اجنٹی میں میر منشی تھے۔ کس مخبر کی مجال تھی ہم سے آنکھ ملا لیتا۔ بلکہ انھوں نے بیسیوں کو پھانسی سے چھٹکارا دلوا دیا۔ اور موئے نصیر مخبر کو جنٹ صاحب سے کہہ کر بیچ بازار میں پھانسی دلوا دی۔ ان کو ایکا ایکی کانپور جانے کا حکم ہو گیا۔ پچیس تیس آدمی ساتھ تھے۔ اور بھی دو تین آدمیوں کے بال بچے تھے۔ باقی سب مرد ہی مرد۔ ہم شام کے لگ بھگ کانپور اُترے وہاں امی جمی ہو چکی تھی۔ مگر شیو راؤ ڈاکو یا باغی ابھی تک قبضہ میں نہ آیا تھا۔ اس کے دو ڈھائی سو آدمی تھے۔ دن بھر جنگلوں میں رہنا۔ اور رات کو جہاں جی چاہا پہنچا مارا۔ پیٹا۔ اور جو ہاتھ لگا لے چلتا ہوا کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ ایک آدھ ڈاکہ نہ ڈالتا ہو۔ اور دو چار آدمی نہ مارتا ہو" اکا ابا کی بہادری مشہور تھی۔

نٹ صاحب نے اسی لئے ان کو کانپور بھیجا۔ جو لوگ ساتھ تھے وہ ان کے تحت تھے اور خوب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رستے بھر انھوں نے جنگل میں منگل رکھا اور کانپور پہونچ چھاؤنی میں ڈیرے ڈال دیئے۔

شام ہو گئی تھی اس لئے رات وہیں گذری صبح کو چھوٹے بوچڑ خانے میں اکا ابّا نے مکان کا انتظام کیا۔ اور ہم دونوں ماں بیٹیاں وہاں چلی گئیں ہمارے برابر ہی دیوار بیچ رسالدار احمد نبی خان کا مکان تھا۔ وہ اکا ابّا سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ہماری دعوت کی ہم دوسرے دن شام کو ان کے یہاں گئے۔ تو میں نے ان کی بیوی کو دیکھا۔ بہت ہنس مکھ اور اچھے مزاج کی بیوی تھیں۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران تھی کہ جو لونڈی ان کے ہاں کام کاج کر رہی تھی وہ مجھ سے اپنا منہ چھپائے لیتی تھی میں نے گھر والی بیوی سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر اس تاک میں رہی کہ کسی طرح اس چھوکری کو دیکھ لوں جب میں کھانے کے واسطے بیٹھی۔ تو چھوکری کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ دیکھتی ہوں تو قمر جہاں بیگم! اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اگر وہی مجھے نہ پکڑتی تو میں گر پڑتی۔ اس نے سنبھالا اور اشارہ سے کہا "خبردار بولنا مت" میں نے ابا جان سے ذکر نہ کیا۔ مگر کھانا کیا خاک کھایا جاتا۔ برائے نام دو چار نوالے کھا اٹھ کھڑی ہوئی۔ قمر جہاں کا نام اس گھر میں آکر چنّی ہو گیا چلتے وقت آپ کی رسالدارنی سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی چنّی کو ساتھ لے جاؤں پرایا محلہ اور اکیلا مکان ہے اکا ابا اب چھاؤنی چلے جائیں گے۔" رسالدار نے کہا "بیٹی شوق سے لے جاؤ" میں باغ باغ ہو گئی۔

اور قمر کو لے گھر آئی۔ اماں جان کو معلوم ہوا کہ یہ قمر ہے تو گلے سے لگا کر اس قدر روئیں بس ہچکی بندھ گئی۔ میں نے اسی وقت اس کو اپنے کپڑے دیئے۔ نہلوایا۔ اور کہہ دیا لونڈی گیری ہو چکی اب کسی کی مجال نہیں کہ تم پر حکومت کر سکے۔ تم بتاؤ بھی تو سہی یہاں کیوں کر آ گئیں۔ قمر یہ سُن کر بہت روئی۔ جب میں نے زیادہ کہا تو کہنے لگی "بوا کیا بتاؤں تقدیر کا لکھا بھگت رہی ہوں اور دیکھئے کیا کیا لکھا ہے تو سنو کیا بیتی۔"

اماں جان تو تھیں ہی نہیں۔ ابا میاں کو جب پھانسی ہو گئی۔ تو گھر میں مُٹھی بھر آٹا بھی نہ تھا۔ دو راتیں تو میں نے جُوں توں گذاریں۔ مگر تیسرے دن دم آنکھوں میں آ گیا۔ اور پانی کی بھی بوند نہ رہی۔ تو رضائی اوڑھ باہر نکلی۔ بھوک پیاس کے مارے جان نکل رہی تھی۔ چاروں طرف بھیک مانگی۔ مگر خدا گواہ ہے جو کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ ہاں پیاؤ پر پانی خوب ڈگڈگا کر پیا آگے بڑھی تو سارا قلعہ جمعہ مسجد کے تلے جمع تھا۔ وہاں پہنچی۔ تو سب رشتہ دار ملنے جُلنے والے مگر کچھ ایسی نفسی نفسی پڑ رہی تھی۔ کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ چنے کی گاڑی گیارہ بجے آتی ہے۔ اور سب کو مُٹھی مٹھی بھر ملتے ہیں۔ بی کیا بتاؤں کہ کیوں کر گذری مجھ میں تو چلنے کی بھی سکت نہ تھی زمین پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ گاڑی آئی تو خدا کی پناہ ایک پر ایک گر رہا تھا۔ دھکا اور مکا، لات اور گھونسہ مگر پیٹ بُری بلا ہے پٹتی کُٹتی پہنچی۔ اور مٹھی بھر چنے جو اس وقت پُلاؤ سے زیادہ تھے دو ہی سانس میں ختم کر لئے۔ چاروں طرف چیل کی طرح منڈلائی۔ لیکن ایک دانہ نصیب نہ ہوا۔

جب رات ہوگئی۔ تو ایک آدمی جس کے پیچھے پیچھے دو نوکر تھے روٹیاں بانٹتا ہوا آیا۔ اس نے مجھ کو بھی ایک روٹی دی۔ میں نے پانچویں روز روٹی کی صورت دیکھی تھی۔ امرت ہوگئی۔ کھا کر پانی پیا۔ کئی وقت کے بعد جو پیٹ بھرا تو ایسی نیند آئی۔ کہ کچھ ہوش نہیں رہا۔ وہیں سر رکھ کر میں لیٹ گئی۔ آنکھ کھلی تو خاصا اُجالا تھا۔ اس طرح تین چار دن گذرے شام کے وقت اس دن دو تین فوجی آدمی آئے۔ ان میں سِکھ بھی تھے، اور مسلمان بھی، مسلمان نے میری طرف دیکھا اور کہا چل ہمارے ساتھ آ روٹی دیں گے میں ساتھ ہولی۔ اس نے اپنے گھر لاکر ایسا مارا کہ آج تک نہ اُبھری۔ یہ وہی رسالدار ہیں۔ اور رسالدارنی ان کی بیوی ہیں۔ کوئی آٹھ دس روز میں وہاں رہی پھر یہ لوگ یہاں چلے آئے۔ اب چاہے لونڈی باندی کہو یا ماما اصیل، نماز کے وقت کی اُٹھی ایک ٹانگ سے پھرتی ہوں جب کہیں جا کر پیٹ بھرتا ہے۔ بیوی تو خیر کچھ رحم کر لیتی ہے۔ مگر رسالدار تو حقہ کو دم بھر دیر ہو جائے یا نہ سُلگے تو چھوٹتے ہی کوڑے سے بات کرتے ہیں۔ کوئی دِن ایسا نہیں جاتا کہ کھال نہ اُدھیڑے دیکھو تو سارا بدن نیلا ہو رہا ہے۔"

اتنا کہکر اس نے کرتا اٹھا کر پیٹھ دکھائی۔ تو اماں اور میں دھاڑوں رونے لگے۔ اس کا جسم رنگین تھا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اماں جان نے ابّا کو ساری کیفیت سُنائی۔ اُنھوں نے قمر کے سر پر ہاتھ پھیرا کہا "بیٹی تم گھبراؤ نہیں اب تم اپنے گھر آگئی ہو اب رسالدار کے نہ جانے دوں گا" میں دیکھ رہی تھی کہ خوش ہونے کے بدلے قمر کچھ ڈرسی رہی تھی۔ اس کا دل کچھ ایسا

مر گیا تھا کہ ہنسی نام کو نہ آتی تھی۔ اکا ابا نے رسالدار سے کہا تو بہت ناراض ہوئے کہنے لگے۔ ہم نے آپ کی اچھی دعوت کی۔ کہ اپنا آدمی ہی ہاتھ سے کھویا۔ آپ اس کو لے کہاں جا سکتے ہیں۔ اس کا نکاح تو میرے نوکر بتّو سے ہو چکا ہے" آکا ابا کو بھی غصہ آگیا اور انھوں نے کہا۔ آپ کو معلوم بھی ہے یہ کون ہے میری بیوی کی بھانجی! مردِ خدا مسلمان ہو تمہارے آگے بھی بیٹی بھانجیاں ہیں سدا دور ایک نہیں رہتا۔ خدا معلوم کل کیا ہوگا۔ اس کے قہر سے ڈرو" رسالدار نے حیل و حجت تو بہت کی مگر آکا ابّا نے ایک نہ سُنی اور پوچڑ خانہ کا مکان چھوڑ قمر کو ساتھ لے کر چھاؤنی میں آگئے۔

جب ڈاکو پکڑ لیا گیا۔ اور ساتھی بھی پھانسی پر لٹک گئے۔ نوا کا ابا دلّی آگئے۔ یہاں آئے ہوئے تقریباً ساتواں مہینہ تھا۔ کہ قمر کو بخار چڑھا جب سے آئے دن کی بیمار ہے۔ بخار چڑھتا ہے پھر اتر جاتا ہے۔ پھر چڑھتا ہے کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اب قمر ہڈیوں کی مالا ہے۔ دُبلی پتلی نازک مزاج لڑکی کو رسالدار ظالم کے کوڑوں نے زندہ درگور کر دیا۔ اب کوئی دن کی مہمان ہے۔ یہاں آنے کو تڑپ رہی تھی۔ مگر ایک قدم بھی چلا نہیں جاتا۔ خدا اس بدنصیب کا انجام بخیر کرے۔

فاتحہ

گوری کی داستان ختم ہوئی رات فضائے آسمانی میں کروٹ بدل رہی تھی طبیعتیں گوری کے بیان سے متاثر ہو چکی تھیں۔ اس پر چند لمحہ کی خاموشی اور وداعِ شب کا درد انگیز سماں دلوں کی کیفیت عجیب تھی۔ مشکل سے گھڑی بھر اس طرح گذری ہوگی کہ پرجبیں دلہن نے روتے ہوئے کہا۔

"بس دِلّی والوں ختم کرو رؤگے تو ہمیشہ مگر اب طبیعتیں سنبھالو اور اپنے اپنے دھندے دیکھو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

پرجبیں دُلہن دوسروں کو سمجھا رہی تھیں مگر اپنی حالت یہ تھی کہ ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ آخر گوہر آرا بیگم نے ان کو پانی پلا کر خاموش کیا۔ اور فرمایا۔۔

ہم تم ختم ہو جائیں گے مگر ہماری داستانیں ختم نہ ہوں گی۔ جب تک دُنیا زندہ ہے ہمارا تذکرہ رہے گا۔ ہم پر جو قیامت ٹوٹی ہے یہ ایسی نہیں ہے کہ آدمی بھول جائے ہماری بپتا دوسروں کے دل ہلا دے گی۔ گورے یا کالے جو کچھ بھی تھے ایسی آفت ڈھائی ہے کہ دلّی اور دلّی والے عمر بھر روئیں گے۔ مجرموں نے جو ستم توڑا ہے اور بے گناہوں کو پھانسیاں دلوا کر جیسے جیسے گھر اُجڑوائے ہیں اس کا بدلہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھیں گے معصوموں کا خون اُوپر ہی اُوپر

نہ جائے گا۔ ان چاروں نامراد مخبروں میں سے ایک کالے کی کھٹیا تو کٹ چکی ۔ دُوسرا جموں پاؤں پیٹ رہا ہے باقی دونوں کا حشر بھی دیکھ لینا۔ اب میلہ اور داستانیں ختم زندگی ہے تو اگلے برس پھر دیکھ لیں گے ۔

برجیس دلہن پانی پی کر سنبھل گئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ ایک دفعہ اور "لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

آواز گونجی اور پھول والی بیگم نے کہا: "مرنے والے ایسے بدنصیب تھے کہ ان شہیدوں کو گور و کفن کچھ بھی نصیب نہ ہوا۔ پھول اور چالیسواں تو الگ رہے ڈھونڈھیں بھی تو پتہ نہیں کہ کس کی قبر کہاں ہے۔ یہ جنتی بندے ایسے بے وارث تو نہ تھے کہ ان کی رُوحیں ترستی پھڑکتی سدھاریں اور دو روٹیاں تک نصیب نہ ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ غدر کے شہیدوں کا کل چالیسواں ہو جائے۔ بوا گوہر آرا بیگم اگر منظور کریں تو اس سے بہتر موقع کونسا ہوگا۔ سارا شہر جمع ہے۔ لیکن اس خالی خولی رونے دھونے سے کیا حاصل جو جس کو نصیب ہوا اپنا اپنا کھانا لے آئے۔ اور یہاں مل بیٹھ کر ان کے نام سے کھالیں۔"

پھول والی بیگم کی رائے سے سب نے اتفاق کیا اور جلسہ سے مُتفقہ آواز آئی کہ بہت خوب ضرور چاہیئے۔ کل ہم سب جو خدا نے دیا ہے اللہ چاہے مغرب کے وقت لے کر حاضر ہو جائیں گے۔"

اب لَو پھٹ رہی تھی اور ہوا اور پرندے روز روشن کی آمد کا غلغلہ بلند کر رہے تھے گوہر آرا بیگم نے کہا: "اچھا بھائی بہنوں خدا حافظ خیر سے شام کو پھر جمع ہوں گے۔ اور آج اپنے مرنے والوں کا چالیسواں کریں گے۔"

جلسہ برخاست ہوا اور لوگ اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے شام سے پہلے ہی خلقت انواع واقسام کے کھانے لے کر آپہونچی۔

افسوس ہے مجھے آج ٹھیک یاد نہیں۔ مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ دیگوں کی گنتی نہ تھی۔ چاروں طرف زردہ بریانی پھیلا ہوا تھا۔ بلا مبالغہ سو سوا سو دیگیں ہوں گی۔ یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ کتنے اور خاندان شریک ہوئے تھے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے شاید ہی کوئی گھر بچا ہوگا۔ زمین آدمیوں کے کھانے سے پٹ رہی تھی۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے حمید مخبر اور اس کا چھوٹا بھائی جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔ گوہر آرا بیگم کو دکھائی دے گئے۔ دیکھتے ہی آپے سے باہر ہوگئیں۔ اور کہنے لگیں۔

ارے جوانا مرگ حمید تو نے تھوڑی مصیبت توڑی ہے۔ کمبخت پھولوں سے بچے تیری بدولت یتیم ہوئے! مہینہ دو دو مہینے کی دلہنیں تیرے ہاتھوں رانڈیں ہوئیں تو نے بھرے پرے گھر اجاڑے اور جوان شیروں کو جو ہمارے آس نہ پاس پھانسی پر لٹکوادیا۔ آج نیک بن کر کھانا کھلانے اور ثواب پہنچانے آیا ہے۔ اسی وقت یہاں سے دور ہو اور نکل جا۔ نہیں تو یاد رکھیو اتنی جوتیاں ماروں گی کہ بھیجا پلپلا ہو جائے گا۔ نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ سارے شہر کو پکڑوا کر گھر گھر کہرام مچوا دیا۔ اب چالیسویں میں شریک ہوا موئے بے غیرت غارت ہو۔ یہاں سے"

گوہر آرا بیگم کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ خلقت ان کے ساتھ ہوگئی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ دم بھر میں حمید کی تکا بوٹی ہو جاتی کہ پھول والی بیگم نے آواز

نکالی۔

"لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

ایک صدا کے ساتھ ہی ایک قہقہہ گونجا۔ اور خود گوہر آرا بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی، تو پھول والی نے کہا۔ بڑی آپا جان اس ناشدنی نے جو کچھ کیا آپ بھگتے گا۔ یہ جانے اس کا خدا جانے۔ تم نے سنا نہیں یہ تو دو جوانوں کو رو چکا لڑکے کی مچمچاتی لاش گھر سے نکلی۔ خاصی اچھی بھلی چنگی بیٹی گھڑی بھر میں چٹ پٹ ہوگئی۔ وہ کس بل سب نکل گیا اب تو اپنے کرتوتوں کو روتا ہے یہ جانے اور اس کا خدا۔ آگیا ہے آ جانے دیجئے۔ ایسا ہی ہے تو اس کے کھانے پر لعنت بھیجئے اور کتوں کو کھلا دیجئے۔ مگر زمین تو اللہ کی ہے ہم کیوں نکالیں پھول والی بیگم کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہوگئے۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ اس کے کھانے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بیٹھا ہے تو بیٹھا رہنے دو۔

حمید کا نام سنتے ہی چاروں طرف سے خلقت نے اسے گھورنا شروع کیا۔ گو پھول والی بیگم کی رائے سے کچھ متفق بھی ہوگئے۔ مگر ہر طرف سے ایسی لعن طعن ہوئی اس کو بیٹھنا مصیبت ہوگیا۔ اور دونوں بھائی آنکھ بچا ایسے چمپت ہوئے کہ پھر صبح تک ان کی صورت نہ دکھائی دی۔

دس بجے ہوں گے یا بجنے والے ہوں گے کہ مولوی نور اللہ خاں نے بآواز بلند فرمایا جب یہ کھانا چالیسویں کا ہے تو ایصال ثواب کے واسطے ختم ہو اس کے بعد کھانا کھایا جائے"

ان کی رائے پسند کی گئی۔ اور بسم اللہ انھوں نے ہی کی۔

دلی میں آج بھی بہت سے حافظ ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے رمضان المبارک میں سینکڑوں مسجدیں آباد ہو جاتی ہیں۔ اور شاید ہی کوئی مسجد ہو جہاں تراویح نہ ہوتی ہو۔ ختم بھی ہوتے ہیں کلام اللہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ لیکن نہ معلوم اُس دَور کے حافظ کیسے تھے۔ ان کی آوازوں میں کیا جادو اور دل میں کیسا درد تھا۔ کہ مجمع پر سناٹا چھا گیا ہزاروں آدمیوں کا ٹھٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی۔ شہر کے مشہور حافظ امیر اللہ خاں کو پہلی مرتبہ میں نے وہیں سُنا۔ اور دیکھا۔ حافظ وزیر نے باوجود بخار کے مصری لہجہ میں ایک رکوع اس طرح پڑھا کہ آنسو نکل پڑے۔ اس کے بعد تو مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ سب کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ختم کے بعد سلیم سلطان نے نعت پڑھی۔ اور دلوں کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ اور بیویاں بھی پڑھنے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ مگر گوہر آرا بیگم نے کہا "بس اب پہلے کھانا کھائیے گیارہ بجے ہیں باسی ہو جائے گا"

کھانے میں خاصے ڈھائی تین گھنٹے صرف ہوئے۔ دو بجے کے قریب فارغ ہوئے تو اُمّی خاں نے جو شہر کا مشہور گویا تھا۔ بادشاہ کی ایک غزل سُنائی۔ اس وقت کی مجلس کا یہ حال تھا کہ کلیجہ مُنہ کو آ رہا تھا۔ مجھے غزل یاد نہیں مگر قدسی کی غزل پر بادشاہ کی تضمین تھی۔ امی کے بعد اور لوگوں نے بادشاہی کی غزلیں پڑھیں۔ اور یہ رات اسی طرح ختم ہو گئی تو حافظ رحمت نابینا نے بلند آواز سے فرمایا۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

وہ کہہ کر کھڑے ہوئے۔ وضو کیا۔ اور ایسی اذان دی کہ میلہ گونج اُٹھا

نماز حافظ ضمیر نے پڑھائی۔ اور اس کے بعد ایک دفعہ اور غدر میں مرنے والوں کی پاک رُوحوں کو ثواب پہونچایا گیا اور بادشاہ کی مغفرت کی دعائیں ہوئیں۔

حمید مُخبر

میلہ صبح ہی اُکھڑ گیا تھا۔ اور دلی والے اپنے اپنے کاموں میں پھنس گئے تھے کہ دو بجے کے قریب اسی حمید کی اچانک موت کی خبر شہر میں پھیل گئی۔ اس کی موت کے واقعات اس قدر تعجب انگیز ہیں کہ بیساختہ خدا کی قُدرت یاد آجاتی ہے۔

خاصا بھلا چنگا دن کے گیارہ بجے تک چاروں طرف پھرا محلہ کے ایک بُڈھے آدمی کو مارا کئی ایک کو گالیاں دیں ایک ایک سے لڑا اور مرزا احمد سے تو یہاں تک کہا۔

میرا نام حمید نہیں جو تم کو شہر کا رہنا ہی بُھلوا دوں۔ جب میں مخبر ہی مشہور ہو گیا تو اب پُوری مخبری کروں گا اور سب کو چھٹی کا کھایا یاد دلا دُوں گا۔"

فیل کا فیل بنا ہوا تھا جس کی طرف منہ کیا وہی سہم گیا۔ ایک بجے دونوں ہاتھوں میں دو گنّے لئے چوراہے کی طرف سے آرہا تھا۔ سیدھے ہاتھ کو چھکڑا تھا۔ اُلٹے ہاتھ پر اُپلوں کے گدھے سامنے سے چمارنی شلجموں کا ٹوکرا لئے آرہی تھی۔ بچکر نکلتا تھا کہ بڑھیا کی ٹکر لگی۔ اس کی جھلی نیچے گری اور اس نے جوانی کے زور میں دو تین گنّے سر پر ایسے مارے کہ غریب خمنم خُون ہو گئی۔ مگر خرّانٹ

گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ عورت خون پونچھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ٹوکرا سر پہ رکھ کر آگے بڑھ گئی مگر نہ چلا گیا اور آگے جا کر پھر گری۔

حمید اینٹھتا ہوا چلا جا رہا تھا چلتے چلتے کلیجہ میں درد اُٹھا "ہائے ہائے" کہتا ہوا زمین پر گرا۔ خون کی قے ہوئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے آنکھیں پتھرا گئیں۔ لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا جو تھا وہ لعنت بھیج رہا تھا۔ اور خدا کی قدرت کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی چارپائی پر ڈال کر گھر لے گیا۔ اور کسی حکیم کو لایا وہاں جا کر کیا گذری یہ تو خبر نہیں ہاں یہ سُنا تھا کہ کُتّے کی طرح ڈیڑھ دو گھنٹہ بھونکا آخر اسی طرح تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ عصر کی نماز میں اس کا جنازہ مسجد میں آیا مگر ایک مسلمان نے بھی نماز نہ پڑھی۔ بڑی مشکل سے آغا حیدر اور مولوی سُلیمان صاحب کے سمجھانے بُجھانے سے کوئی سات آدمی شریک ہو گئے اور اس طرح مغرب سے پہلے پہلے اس بدبخت کا جنازہ "قدم شریف" میں پہونچا اور رات کے اندھیرے میں جب روشنی برائے نام تھی۔ گورکنوں نے اوندھا سیدھا دبا دیا۔ اس کی موت نے ساری دِلّی کو سبق دیا۔ اور مُدّتوں اس کا چرچا شہر کے بچہ بچہ کی زبان پر رہا۔

اس کی مچھاتی لاش پر چاروں طرف لعنت برس رہی تھی۔ اگر دو چار آدمی بیچ بچاؤ نہ کرتے تو خدا معلوم اس کا کیا حشر ہوتا۔ شاید شہر والے اس کا تِکّا بوٹی کر ڈالتے۔ بڑے بھائی کی جو شامت آئی۔ تو پھول کر بیٹھا لیکن شہر والے تو درکنار محلہ کا بھی کوئی آدمی جا کر نہ پھٹکا۔ "پھاٹک حبش خاں" میں مولوی احمد اللہ صاحب کا یتیم خانہ تھا۔ سارا کھانا وہاں بھیجا۔ مگر انھوں نے بھی لینے سے انکار کر دیا۔

اب نہ معلوم کتوں نے کھایا یا بلیوں نے۔ بہرحال اس کی موت کا وہ حشر ہ کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔

میلہ کے بعد

شہر میں اب امی تمی تھی۔ مگر دلی والوں کے دل بادشاہ کے سا اس اطمینان کو رو رہے تھے جو غدر سے پہلے نصیب تھا۔ گوروں ک رعب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دور سے صورت نظر آجاتی تھی تو بعض اللہ کے بندے کانپ جاتے تھے۔

غدر کے بعد جو انقلاب ہوا وہ ایسا نہ تھا کہ دلی اس کو آسا سے فراموش کر دیتی ہزاروں کھاتے پیتے دو دو دانوں کو محتاج ہو جن کے گھروں پر گھوڑے بندھے ہوتے تھے ان کو روٹی تک نصیب نہ تھی۔ تمنا ان بدنصیبوں کا پیٹ بھی بھر رہی تھی۔ اور دل بھی بہلا رہی تھی۔ صبح اٹھے اور مچھلی کی ڈور کانٹے لئے اور دریا پر جا پہونچ۔ کوئی رات کی بچی بچائی باسی کوسی روٹی بغل میں ماری دو چار پا کے ٹکڑے مٹی کا حقہ سا منھ لیا اور وہیں شام کر دی۔ اگر کوئی مچھ مل گئی تو فبہا محلہ بھر میں عید ہو گئی۔ کچھ بیچی کچھ بانٹی کچھ کھائی۔ کچ رکھی۔ نہ ملی تو چپکے سے آ کچھ موجود ہوا کھا کر ورنہ فاقے سے چپکے پڑ رہے۔

شہزادوں کا یہ خاندان غدر کے بعد کچھ شادی بیاہوں کے اور کچھ کام کے سلسلہ میں منتشر ہو کر دوسرے شہروں میں پہونچ گیا۔ یہ جس وقت کا ذکر ہے اُس وقت دلّی شہزادوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مگر افلاس نے ایسی بُری گت بنادی تھی۔ کہ روٹی تھی تو کپڑا نہ تھا۔ اور کپڑا تھا تو روٹی نہ تھی۔

دلّی میں جو میلے اس سے پہلے ہوئے وہ میں نے نہیں دیکھے۔ مگر اس کے بعد میلے بھی دربار بھی دیکھے جلسے اور محفلیں بھی دیکھیں۔ اور کانفرنسیں بھی دیکھیں۔ مگر جو صورتیں میلے میں نظر آ گئیں وہ تو پھر کیا نظر آتیں ان جیسی بھی دیکھنے میں نظر نہ آئیں! ہاں پھُول والی بیگم جب تک زندہ رہیں ان کی اہسکار اور اُن کے پھولوں کی مہکار وہ سماں یاد دلاتی رہی۔

برجیس دلہن جو اس میلے کی جان اور گوہر آرا بیگم جو برات کی دلہن تھیں بہت روز تک زندہ رہیں۔ برجیس دُلہن کلاں محل کے پاس رہتی تھیں۔ مگر گوہر آرا بیگم اپنی نند کے ساتھ سُلطان جی چلی گئیں تھیں کبھی کبھی پھول والی بیگم کے ہاں ان شہزادیوں کا جمگھٹا ہو جاتا تھا۔ عید اور بقرا عید پر سب کی سب پھول والی بیگم کے یہاں جمع ہوتیں اور خُوب رنگ رلیاں منالیتی تھیں۔ قطب میں بھی ”اندھیری باغ“ میں ایک برسات میں نے اس میلے کے سات یا آٹھ سال بعد شہزادیوں کی دیکھی تھی۔ جھولے پڑے ہوئے تھے اور آم جامنوں میں جھلیاں رکھی

ہوئی تھیں کڑھائیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور پینگیں بڑھ رہی تھیں۔ پھول والی بیگم جس وقت جھولے میں بیٹھی تھیں۔ سلطانہ بیگم اور برجیس دلہن جن کے ساتھ اور بہت سی بیبیاں تھیں۔ جھولا جھول رہی تھیں۔ پھول والی بیگم نے جس وقت یہ ملہار شروع کیا۔

"جھلوا جھلاتے ناگن ڈس گئی"

تو باغ گونج اٹھا تھا۔ شام تک چہل پہل رہی۔ گوہر آرا بیگم کو میں نے اس کے بعد نہیں دیکھا۔ سنا ضرور کہ زندہ ہیں۔ اسی طرح برجیس دلہن بھی پھر نظر نہ آئیں۔ ہاں پھول والی بیگم کی صدا روز رات کو بلند ہوتی رہتی۔ وہ کبھی کبھی جب جی چاہتا تھا۔ تو خود ہی بادشاہ کی کوئی غزل الاپتی تھیں۔ مگر جہاں انھوں نے غزل شروع کی اور دوکان کے آگے بھیڑ لگی۔ رات کے سناٹے میں شاید ہی کوئی ایسا سنگ دل ہوتا ہوگا جس کے کلیجہ میں بیگم کی آواز نہ گھستی ہو۔

افسوس یہ ہے کہ بیگم کے سوا جن کو سرکار سے کچھ نہ ملتا تھا۔ باقی اور سب شہزادیوں کی جن کو ماہانہ وظیفہ مل رہا تھا۔ حالت نہایت ردی تھی۔ ٹھیک یاد نہیں مگر گوہر آرا بیگم کے ہاں سب مل جل کر پچاس روپے سے کم کا وظیفہ نہ ہوگا۔ مگر ان کے بندوق، بٹیر، پتنگ، تیتر، چنڈول، کبوتر، مرغ، گلدم، ہر رنگ میں رنگے تھے۔ یقینی طور پر تو کہنا مشکل ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ مہینہ میں ایک آدھ فاقہ ضرور ہوتا ہوگا۔

بوا قمرا

گوہر آرا بیگم کی بھتیجی قمرا جس کو انھوں نے بیٹی بنا لیا تھا۔ پہلی بیوی کے مر جانے کے بعد سلطان دولھا سے بیاہی گئی۔ یہ سب ہی گنوں پورے تھے۔ لمبی سفید داڑھی تھی۔ مگر چوک پر روزانہ کبوتر ہاتھ میں لئے موجود ہوتے تھے۔ ٹوپی تو میلی ہوتی تھی۔ مگر ہوتی وہی شاہانہ تھی میں نے ان کو چوک پر لیتڑے پہنے اور ننگے پاؤں پھرتے دیکھا ہے گوہر آرا بیگم اور سلطان دولھا کے بعد اس لڑکی قمر کی حالت بہت ابتر ہو گئی۔ بچہ نہ تھا۔ اور اس قابل بھی نہ رہی تھی۔ کہ نکاح کر لیتی۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر ہو گی۔ مگر افلاس نے قبل از وقت بڑھاپے ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ وہ پھرتی پھراتی میرے ماموں کے ہاں ماماگیری کے واسطے آئی اور ایک روپیہ مہینہ اور روٹی پر نوکر ہوئی۔ اس کی عمر غدر میں سات آٹھ برس کی ہو گی۔ مصائب کے تمام پہاڑ اس کے سر سے گذر چکے تھے۔ خاندان تیموریہ کی تباہی و بربادی میں وہ برابر کی شریک تھی۔ اور اس کی زندگی بتا رہی تھی۔ کہ کس طرح سیجوں پر سونے والیاں خاک میں بسر کرتی ہیں۔

رات کے وقت جب بوا قمرا جن کو بچے خالہ کہتے تھے۔

کام کاج سے فارغ ہو جاتیں تو اُن کے پاس جا بیٹھتے۔ اور وہ غدر کی داستانیں اس طرح سُناتیں کہ بعض مرتبہ بڑے بُوڑھے بھی شوق سے سُنتے انھوں نے اپنی آنکھ سے ایسے خاندانوں کی بربادی دیکھی تھی۔ کہ سُن کر بدن کے رُونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور میری رائے میں تو وہ خود بھی انقلاب کی پُوری تصویر تھیں۔ ان کا پھٹا ہوا بُرقع اور لوٹی ہوئی جُوتی اس وقت تو نہیں۔ مگر آج عالمِ تخیل میں میرے واسطے درس عبرت ہے۔

غدر کی ماری بیگمات

کی

دردناک داستانیں

امام المشائخ مصور فطرت

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب

سجادہ نشین

درگاہ حضرت محبوب الہی

دہلی

شاہ نظر کی آپ بیتی

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را

میرا نام شاہ نظر ہے میں حضور جہاں پناہ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی مملوکہ بونڈی ہوں اب میری عمر نوے سال سے زیادہ ہے ۱۸۵۷ء کے غدر میں خوب جوان تھی میرے باپ کانگڑے کے رہنے والے تھے۔ اور زمینداری اور کاشتکاری ان کا پیشہ تھا دس گیارہ سال عمر میں مجھ کو چند ڈاکو پکڑ کر لاہور لے آئے۔ اور وہاں ایک بازاری عورت کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ جس نے گانا بجانا سکھایا مجھے اپنا گھر اور اپنے ماں و باپ اب تک یاد ہیں جب میں اپنے کھیت پر کھڑی تھی۔ اور میرا باپ کسی کام کے لئے گھر گیا تھا کہ چند ڈاکو گھوڑوں پر سوار ادھر سے آئے اور مجھکو جبراً پکڑ کر اٹھالیا۔ میں روتی اور چیختی چلاتی رہ گئی۔ مگر کوئی شخص میری مدد کے

لئے نہیں آیا۔ لاہور میں آتے کے بعد بھی دو برس تک میں ہمیشہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رویا کرتی تھی۔ جس طوائف نے مجھے خریدا تھا۔ اس کا نام نو بہار تھا۔ اور پچاس ساٹھ برس کی بڑھیا تھی اور سکھوں کی حکومت سے اس نے بہت روپیہ کمایا تھا۔

نو بہار پڑھی لکھی عورت تھی۔ اسکو ایک صوفی صاحب روزانہ مغرب کے بعد آکر عربی پڑھایا کرتے تھے۔ اور نو بہار نے مجھ کو بھی ان صوفی صاحب سے جن کا نام فیض اللہ تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم دلائی تھی۔ چنانچہ میں نے چودہ سال کی عمر میں عربی اور فارسی اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ لیکن میری عجیب حالت تھی کہ دن رات تفسیر جلالین اور مشکوٰۃ شریف اور شرح وقایہ اور ہدایہ پڑھتی تھی۔ اور اس کے ساتھ مجھ کو ناچنا اور گانا بھی سیکھنا پڑتا تھا۔

دہلی کا سفر!

میری نئی ماں نو بہار لاہور سے دہلی آئی۔ تو مجھ کو بھی ساتھ لائی اور دہلی سے اجمیر شریف کی درگاہ میں گئی۔ اجمیر شریف کی زیارت کر کے پھر ہم دہلی میں آئے اور سبز منڈی کے پاس ایک سرائے میں ٹھہرے۔ ایک دن میری ماں لاہور جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں کہ ایک شاہی چوبدار سرائے میں آیا اور میری ماں سے کہا۔ کہ حضور بادشاہ

سلامت کے وزیر محبوب علی خاں صاحب نے رتھ کی سواری بھیجی ہے اور تم کو تمھاری بیٹی سمیت یاد فرمایا ہے۔ نو بہار نے جواب دیا کہ میری طرف سے وزارت پناہ کی خدمت میں دست بستہ تسلیم عرض کرنا۔ میں آج ہی لاہور جانے والی ہوں اور سفر کا سامان کر چکی ہوں گھر سے آئے چھ مہینے ہو گئے اب میں زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ چوبدار یہ بات سن کر چلا گیا۔ نو بہار نے مجھ سے کہا بیٹی اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم کو بہت جلدی لاہور چلنا چاہیئے۔ وزیر صاحب یا بادشاہ سلامت کا خیال ہو گیا۔ تو تیری اور میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ہم لاہور میں آزادی سے رہتے ہیں۔ اور یہاں لونڈی غلام بن جائیں گے۔ میری ماں نے میرا نام مہ نور رکھا تھا۔ لیکن ماں باپ نے میرا نام حیاتن رکھا تھا۔ جس وقت نو بہار نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ تو میں نے اس سے کہا کہ لاہور میں رہتے ہوئے بہت دن ہو گئے دلی بادشاہوں کی جگہ ہے کیا ہرج ہے کہ ہم دو چار مہینے یہاں پر بھی رہیں۔ نو بہار نے کہا تو بچی ہے۔ بادشاہوں کی حالت کو نہیں جانتی۔ یہ کہہ کر اس نے فوراً سرائے کے بھٹیارے سے کہا کہ ہماری بیل گاڑی کو تیار کرا ہم آج ہی رات کو تین بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد اسباب باندھنا شروع کیا۔

دو گھنٹے کے بعد وہی چوبدار چند سواروں کے ساتھ پھر آیا اور اس نے کہا حضور وزارت پناہ نے فرمایا ہے۔ کہ کسی مخبر نے حضور بادشاہ سلامت کو تمہاری لڑکی کی علمی قابلیت کی خبر دی ہے اور جہاں پناہ نے مجھے حکم بھیجا

ہے کہ پہلے میں تم دونوں کو اپنے پاس بلاؤں۔ اور مخبر کی اطلاع کی نسبت اچھی طرح تحقیقات کر کے تم کو دربار شاہی میں حاضر کروں۔ یہ سنتے ہی میری ماں کا چہرہ فق ہو گیا اور میں بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ میں نے مسلمان بادشاہوں کا دربار کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ کسی مسلمان بادشاہ یا وزیر کو دیکھا۔ میری ماں نے ہر چند عذر کیا۔ اور ٹالنے کی کوشش کی مگر ہمارا اسباب سرائے میں رہا۔ اور ایک سوار کا پہرا مقرر کر دیا گیا۔ ہم وزیر صاحب کے مکان پر پہونچے۔ راستے میں ہم نے دیکھا کہ دلی کے سب مکان کھپریل کے ہیں۔ فقط بڑے بڑے امیروں کی حویلیاں پکّی بنی ہوئی ہیں۔ وزیر صاحب کی حویلی بھی خوب بڑی تھی ہمارا رتھ کئی ڈیوڑھیوں کو عبور کر کے اندر پہنچا۔ اور ہم کو ایک بڑے دالان میں اُتارا گیا۔ جہاں ایک کالی سی بڑھیا عورت کھڑی تھی جس کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ اور دو خوجے لال کپڑے پہنے ہوئے بڑھیا کے پاس کھڑے تھے۔

بڑھیا نے ماں نو بہار سے باتیں کیں۔ اور تھوڑی دیر میں میرا اور میری ماں کا سارا حال پوچھ لیا۔ میرے ناچنے گانے اور عربی فارسی کا سارا حال پوچھا۔ اور ہم کو دالان میں بٹھا کر خود اندر چلی گئی تھوڑی دیر کے بعد ایک خوجہ باہر آیا۔ اور ہم دونوں کو اندر لے گیا۔ وہاں مسند پر ایک وزیر صاحب بیٹھے تھے۔ میری ماں نے جھک کر انھیں سلام کیا اور پھر مجھ سے سلام کرنے کو کہا میں نے بھی سلام کیا۔ وزیر صاحب نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ اور کچھ مسکرائے۔ اور دیوان حافظ کا ایک شعر پڑھا۔

میں شرمائی اور نظریں نیچی کرلیں۔ اس کے بعد میں نے جرأت کرکے دیوان حافظ کا دُوسرا شعر پڑھا جو وزیر صاحب کے شعر کے جواب میں تھا۔ وزیر صاحب یہ شعر سُن کر بہت خوش ہُوئے۔ اور انھوں نے خوجہ کی طرف اشارہ کیا جو فوراً باہر چلا گیا۔ اور چند سازندوں کو اپنے ساتھ لے کر آگیا۔ وزیر صاحب نے حکم دیا کہ حافظ کی ایک غزل ساز کے ساتھ سُنا دیجئے۔

ساقیا برخیز در دہ جام را

میں نے غزل گائی وزیر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی مجھ کو انعام میں دی۔ اس کے بعد ہم کو باہر کے دالان میں ٹھہرا دیا گیا۔ جہاں ضرورت کا سب سامان موجود تھا۔ رات کو ہم وہاں رہے اور دوسرے دن صبح دس بجے وزیر صاحب نے ہم دونوں کو بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیج دیا۔ جہاں ہم کئی جگہ روکے گئے۔ ایک بجے کے قریب ملاحظہ جہاں پناہی میں پیش ہوئے۔ بادشاہ سلامت سانولے رنگ کے تھے۔ ان کی مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا ان کی بیگم زینت محل سامنے مسند پر بیٹھی حُقہ پی رہی تھیں۔ اور بادشاہ سلامت کے سامنے بھی پیچوان لگا ہوا۔ اور ایک خوجہ پُشت پر کھڑے مورچھل ہلا رہا تھا۔ بادشاہ سلامت نے خوجہ کی طرف گردن موڑی اور ”ہوں“ کہا خوجہ نے نو بہار سے پُوچھا۔ اور پھر مجھ سے کہا کہ جہاں پناہ کو معلوم ہوا ہے کہ تم نے عربی فارسی پڑھی ہے اور تم فقہ و حدیث بھی خوب جانتی ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَوْ مَامَلَکَتْ

اَیْمَانُکُمْ" اس کا مطلب کیا ہے میں یہ سُن کر کھڑی ہوئی۔ میری ماں نے مجھے درباروں کے آداب سکھا دیئے تھے اس لئے میں نے ادب سے بادشاہ سلامت کے سامنے سر جھکایا۔ اور پھر عرض کیا کہ اجازت ہو تو اس سوال کا جواب عرض کروں۔ بادشاہ سلامت منہ سے نہ بولے۔ اور انھوں نے پھر "ہوں" کر دیا۔ میں نے خوجہ سے کہا۔ کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں جو مسلمانوں کی مملوک ہوں" کیونکہ اس آیت سے پہلے کی آیت میں نکاحی بیویوں کا ذکر ہے۔ اور اس آیت میں لونڈیوں اور مملوک عورتوں کا ذکر ہے خوجہ نے کہا۔ کیا تم حضور ظلِ سبحانی کی مملوکیت میں آنا پسند کرتی ہو میں نے کہا۔ میں اپنی ماں کی مملوک ہوں۔ اور میری ماں جہاں پناہ کی مملوک ہیں ہم سب تو پیدائشی حلقہ بگوش ہیں۔ یہ سُنتے ہی میری ماں کھڑی ہوگئی اور اس نے رو کر کہا۔ جہاں پناہ یہ میری ایک ہی بیٹی ہے اور میں نے اس کو بڑی مصیبت سے پالا ہے اور تعلیم دلوائی ہے چونکہ یہ مولوی ہوگئی ہے اس واسطے اس کی شادی کروں گی۔ خوجہ نے کہا کہ جہاں پناہ ہی تمہاری لڑکی کی شادی کرادیں گے وہ تو صرف اس لڑکی کی علمی باتیں اور کبھی کبھی گانا سُننا چاہتے ہیں۔ اور تم کو دس ہزار روپیہ نقد اور ایک سو روپیہ ماہوار اور ایک مکان اور سواری عطا فرمائیں گے۔ میری ماں نے جب یہ رقم سُنی۔ تو خوش ہوگئی۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مجھے ظلِ سبحانی کا ارشاد بسر و چشم منظور ہے۔

لال قلعہ میں قیام

اس کے بعد ہم کو لال قلعہ میں ایک مکان رہنے کو مل گیا۔ اور شاہی باورچی خانہ سے کھانا بھی مقرر ہو گیا۔ اور چند خدمت گار بھی خدمت کے لئے مل گئے۔ میں آٹھویں دن جمعرات کو اپنی ماں کے ساتھ بادشاہ سلامت کے سلام کو جایا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی بادشاہ سلامت مجھ سے دو چار غزلیں سُن لیتے تھے۔ اور کبھی کبھی بادشاہ سلامت مجھ سے خود بھی باتیں کرتے تھے مگر ملکہ عالم زینت محل صاحبہ مجھ سے ہمیشہ ناخوش معلوم ہوتی تھیں۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ مہ نور ہم نے تیرا نام بدل دیا۔ اب تجھ کو شہ نظر کہا کریں گے۔ اور اس کے بعد قلعہ کے ایک ممتاز عہدیدار سے میرا نکاح کرا دیا۔ اور میں نہایت عیش اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگی۔

دو سال بعد میری ماں نو بہار کا انتقال ہو گیا۔ اور لاہور سے جتنا سامان میری ماں نے منگوایا تھا۔ وہ سب میرے ہی حصہ میں آیا۔ اور یہاں شاہی دربار سے جو کچھ عطا ہوا تھا وہ بھی میرے ہی پاس تھا۔

اگرچہ میرا نکاح ہو گیا تھا۔ لیکن میں بادشاہ سلامت کی لونڈی سمجھی جاتی تھی۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مجھ سے پوچھا شہ نظر تو میری مملوک اور میری لونڈی ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ بجا ارشاد

ہوا لیکن کنیز جان کی امان پائے تو کچھ عرض کرے۔ ارشاد ہوا کیا کہنا چاہتی ہے میں نے کہا حضور شریعت اسلام سے واقف ہیں۔ جو لونڈی غلام آج کل لوگوں کے پاس رہتے ہیں۔ وہ شریعت کے موافق لونڈی غلام نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ کسی جہاد میں نہیں پکڑے گئے۔ اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ کافروں سے دین کی لڑائی ہو۔ اور اس میں جو کافر عورت مرد پکڑے جائیں وہ لونڈی غلام ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے یہ بات سن کر مجھے غور سے دیکھا۔ اور مسکرا کر رومال اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اس کے بعد ہاتھ سے اشارہ کیا کہ جاؤ میں چلی آئی۔ دوسرے دن میرے خاوند نے مجھ سے کہا کہ بادشاہ سلامت تمہاری شرعی لیاقت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میری لونڈی نے بالکل ٹھیک کہا۔ آج کل کے سب لونڈی غلام شریعت کے موافق مملوک نہیں بلکہ نوکر ہیں۔

غدر

میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد مجھے بخار آنے لگا تھا۔ اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب میرا علاج کر رہے تھے۔ تیز گرمی کا زمانہ تھا۔ کہ غدر ہو گیا۔ باغی فوجیں دہلی میں آئیں۔ اور انھوں نے انگریزوں کا قتل عام کر دیا چار مہینہ تک شہر میں بڑی پریشانی رہی۔ اور میرا بخار بھی دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ دق ہو گئی ہے۔

میری لڑکی بھی بہت کمزور اور بیمار تھی۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی فوج نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اور بادشاہ سلامت اور سب بیگمیں اور سب شہزادے قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے۔ مگر میں اتنی کمزور اور ناتواں تھی کہ گھر سے باہر نہ جا سکی۔ اور میرے خاوند بھی میرے پاس رہے البتہ نوکر سب بھاگ گئے۔

ہم دونوں میاں بیوی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کہ دیکھئے تقدیر اب کیا دکھاتی ہے۔ اتنے میں چند پنجابی سپاہی جن میں سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی تھے۔ مکان کے اندر گھسے اور انھوں نے آتے ہی میرے خاوند کو پکڑا۔ اور اس سے نقدی اور زیورات کا حال پوچھا۔ میرے خاوند نے صندوقچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں سب کچھ ہے۔ میں نے غیر مردوں کو آتے دیکھ کر کپڑا منہ پر ڈال لیا تھا۔ اور بچی میرے پاس لیٹی تھی۔ جب سپاہیوں نے زیور اور نقدی کے صندوقچہ پر قبضہ کر لیا۔ تو پھر گھر کے دوسرے سامان کو باندھنا شروع کیا اور ایک بڈھے سپاہی نے میرے چہرے پر سے چادر اٹھائی۔ کیونکہ اس کو یہ شبہ تھا کہ اس چادر کے ------ نیچے بھی کچھ مال ہے۔ میری چادر کو ہاتھ لگاتے دیکھا۔ تو میرے خاوند نے اس کو ڈانٹ کر منع کیا۔ کہ بیمار اور پردہ نشین عورت کو ہاتھ مت لگاؤ۔ بڈھے سپاہی کو غصہ آگیا۔ اور اس نے میرے خاوند کو سخت جواب دیا۔ اور فوراً آگے بڑھ کر بندوق کا کندہ میرے خاوند کے مارا۔ میرے خاوند نے بھی اس کو کھڑے ہو کر دھکا دیا جس سے

وہ سپاہی میرے پلنگ پر گر پڑا اور کچھ ایسے بے ڈھب طریقے سے گرا کہ میری بچی کی گردن ٹوٹ گئی۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور میں نے بے حجاب ہو کر ہائے میری ننھی کہا۔ اور اس کو گود میں اُٹھا لیا۔ لڑکی کے ایسی ضرب آئی تھی کہ وہ دو تین سسکیاں لے کر جان بحق ہو گئی۔ بڈھے نے اس وقت میری بچی کی حالت دیکھی تو لڑائی جھگڑے کو بھول گیا۔ اور فوراً میری طرف جُھکا اور کہا کہ بیٹی معاف کیجیو میں نے تیری بچی کو نہیں مارا۔ تیرے مرد نے مجھے دھکا دے کر گرایا تھا۔ میرے دل پہ پہلے ہی ایک لڑکی کی جُدائی کا داغ ہے دس گیارہ برس ہوئے کہ وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔ معلُوم نہیں کہ کون اسے چُرا کر لے گیا۔ اس واسطے تیری اس بچی کا صدمہ میرے غم کے لئے ایک نشتر بن گیا۔ میں نے اس بڈھے سپاہی سے یہ بات سُنی تو گھبرا کر غور کیا۔ اس کی شکل دیکھی اور فوراً پہچان لیا کہ وہ سپاہی میرا کانگڑہ والا باپ ہے اور میں نے ایک چیخ ماری اور کہا کہ باواجی میں ہی تمہاری حیاتن ہوں میرا باپ یہ بات سن کر کانپنے لگا۔ اور مجھ کو دیکھتے ہی دیکھتے غش کھا کر گر پڑا۔ میرے خاوند اور دُوسرے سپاہیوں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ اور بہت دیر کے بعد اس کو ہوش آیا۔ تب میں نے اپنی تمام حقیقت باپ کو سُنائی۔ اور میرا باپ بہت دیر تک روتا رہا۔ اور میں بھی روتی رہی اس کے بعد بچی کی نعش کو وہیں مکان میں دفن کر دیا۔ اور میرا باپ اور اس کے ساتھی باہر جا کر ایک رتھ لائے جس میں مجھ کو اور میرے خاوند کو فوراً سوار کرایا۔ اور لُوٹ کے سامان کو بھی رتھ میں رکھ لیا۔ اور پھر ہم پہاڑی پر گئے۔ جہاں انگریزوں

کی چھاؤنی تھی۔ اور کچھ دن کے بعد میرا باپ مجھ کو اور میرے خاوند کو اپنے ساتھ لے کر کانگڑہ گیا۔ اور وہاں پچاس سال عمر تک رہی اور وہاں میرے کئی بچے ہوئے اور میرے خاوند کا انتقال بھی کانگڑہ میں ہوا۔ اور میرا باپ بھی مر گیا۔ نہ میرے کوئی بھائی تھا نہ بہن تھی۔ باپ اور خاوند کے مرنے کے بعد میں بالکل لاوارث ہو گئی۔ اور اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیم میں کوشش کرتی رہی یہاں تک کہ وہ ہوشیار ہو گئے اور ان کی شادیاں ہو گئیں۔ اب وہ صاحب اولاد ہیں۔ اور میں ایک پوتے کے ساتھ اس نوے سال کی عمر میں اجمیر شریف کی یہ دوسری زیارت کرنے آئی ہوں اب دیکھتی ہوں کہ دہلی کا اور رنگ ہے پہلے یہاں سب مکان کھپریل کے تھے اور اب جدھر دیکھتی ہوں پکی پکی شاندار حویلیاں نظر آتی ہیں۔ پہلے میں نے لاہور سے دہلی اور دہلی سے اجمیر تک بیل گاڑیوں میں سفر کیا تھا اور اب ہر جگہ ریل نظر آتی ہے۔ ایک وقت تھا جب اجمیر شریف کی زیارت کر کے دہلی میں آئی قسمت نے بادشاہی محل تک پہنچایا اور ایک وقت یہ ہے اجمیر شریف سے دہلی آئی ہوں قبر سامنے دکھائی دے رہی ہے جو چند سانس باقی ہیں انھیں کی بہار ہے۔ اب نہ وہ نو بہار باقی ہے نہ مہ نور نہ شہ نظر، نہ محبوب علی خاں وزیر نہ بہادر شاہ بادشاہ نہ احسن اللہ خاں حکیم اب تو دہلی پہچانی بھی نہیں جاتی جو دم آتا جاتا ہے کیا خبر اس کا کیا انجام ہونے والا ہے ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا۔ اب آنکھیں بند کروں گی اور کفن اوڑھ کر قبر میں قیامت تک سوتی رہوں گی ۔

گنہگار جب بے گناہوں کو قتل کر رہے تھے
جب شہر دہلی کے در و دیوار ماتم کرتے تھے

اور

مقبرہ ہمایوں بھی خاموش تھا

اس کتاب میں

غدر ۱۸۵۷ء کی دردناک داستانیں علامہ راشد الخیری اور
حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم کی لکھی ہوئی آپ نے
پڑھی ہیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کی عبرتناک داستانیں ابھی تک تاریخ
میں نہیں آئی ہیں۔ ذرا ۱۹۴۷ء کے متعلق باقر علی مہدی کی
لکھی ہوئی ایک داستان پڑھ لیجئے۔

عبداللہ فاروقی

مقبرہ ہمایوں کے پناہ گزیں

ہندوستان کو آزادی ملے چند ہفتے گذرے تھے۔ غلامی کے جنگل میں پھنسے ہوئے انسان کے لئے آزادی کی فضا کچھ عجیب سی تھی۔ وہ اپنے کو اجنبی سا محسوس کرتا جیسے آزادی نہیں ہے یا جیسے آزادی اور غلامی میں بہت کم فرق ہے ہند کی تقسیم اور آزادی کو ہم انگریزوں کی سیاست سمجھ رہے تھے۔ پنجاب میں جو آگ جماعتوں نے بھڑکائی تھی۔ خود ان کے ہاتھ جلے جا رہے تھے جن سے ان کی زندگی جھلسی جا رہی تھی۔ اس کا دھواں زہریلا دھواں ہندوستان پر چھا رہا تھا۔ یہ بادل دہلی پہنچ کر بھی سیاہ ہو گئے۔ پھر یہاں بھی شعلے بھڑک اٹھے۔ آزادی کی دیوی جو مغربی

بازی گروں کے دام سے نکل رہی تھی۔ پھر سیاہی میں گھر گئی تھی تاریکی چھٹتے چھٹتے پھر پھیلنے لگی۔ یہ ظالم و مظلوم کی جنگ نہ تھی یہ عدل و انصاف کی لڑائی نہ تھی یہ نور و ظلمت کا تصادم نہ تھا۔ یہ نیکی و بدی کا ٹکراؤ نہ تھا۔ یہ حق و باطل کی پیکار نہ تھی بلکہ شیطنت کا سب سے بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ بربریت کا شاندار اعلان تھا۔ جب انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہنا۔ یہ آزادی کا پُرجوش استقبال تھا جو چاہے کرو۔ دل و دماغ کی غلامی سے آزاد ہو کر مکمل مساوات، مکمل آزادی، مذہب کے نام پر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ نالہ و شیون کی صدائیں فسادیوں کی آوازیں ہم آہنگ تھیں۔ تاریکی ہی تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ آج برسوں بلکہ صدیوں کے بعد ہمایوں کے مقبرہ کا دل دھڑک رہا ہے۔ جب بھی دہلی شہر ویران ہوا ہے۔ مقبرہ کی رُوح تھرا کر رہ گئی ہے۔ لوگ معصوم اور شریف لوگ، فساد اور دنگے سے دور رہنے والے لوگ جوق در جوق قافلہ کی صورت میں مشرقی دروازے سے گھستے چلے آ رہے تھے اُونچی اُونچی دیواریں جا بجا سے شکستہ اور حیران و ششدر کھڑی تھیں۔ جیسے وہ بھی موت کے خوف سے لرزہ براندام تھیں۔ آج انسان زندگی کا دامن چاک کر کے موت کو لبیک کہہ رہا تھا۔ فرقہ پرست انسانیت کو ختم کر دینے پر تلے ہُوئے تھے ظلم اور بربریت کی زنجیریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ مقبرہ خاموشی اور ویرانی کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ آج برسوں کے بعد ہمایوں کی رعایا اس سے پناہ کی طالب تھی۔ جہاں ہُو کا عالم رہتا تھا۔

جس کو سیّاح عمارت قدیمہ سمجھ کر شکستہ اور بوسیدہ سمجھ کر اہمیت نہ دیتے تھے۔ جو مطلق الحکم شہنشاہوں کی استبدادیت کے نشانات سمجھے جاتے تھے۔ جب انسان جاگیرداری کے دور سے گذر رہا تھا۔ اس زمانے کی یادیں اس سے وابستہ ہیں جس میں زندگی محدود تھی۔ مگر زندگی تھی۔ جینے کے سہارے موجود تھے۔ آج سانس لینے کی ممانعت تھی۔

ستمبر کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ آگ یکایک تیزی سے پھیل گئی جیسے کسی نے تیل پہلے ہی سے چھڑک رکھا تھا۔ ہزاروں مسلمان سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے جو سیاست سے نابلد تھے۔ مارے جا رہے تھے۔ اُمراء کے لئے ہوائی جہاز اڈوں پر منتظر تھے۔ اوسط درجے کے لوگ جو اپنی دولت بچا سکتے تھے ان کی تقلید کر رہے تھے۔ ہوائی جہاز شعلوں سے اوپر پرواز کرتے ہوئے پاکستان جا رہے تھے۔ دولت انسان کو بچا رہی تھی، اس ہفتہ کی آخری رات کو لوگ پناہ لینے کے لئے سبزمنڈی سے، پہاڑ گنج سے، دریا گنج سے، لودی روڈ سے، کناٹ سرکس سے، قرولباغ سے قافلہ کی صورت میں مقبرے میں آ رہے تھے۔ چاندنی رات کا کفن اِن کے استقبال کے لئے پھیلا تھا لوگ بُرجوں میں گھُس گئے۔ دروازوں میں اور نیچے کی کوٹھریوں میں ٹھہر گئے۔ مقبرے کے چاروں طرف کے لان میں پیڑوں کے نیچے ٹھہر گئے پچھلی رات کو بھی بچے خوف سے چیخ رہے تھے۔ نویں بار یہ دارالسلطنت لُٹ رہا تھا جو ہمیشہ آزادی کے سلسلہ میں تباہ ہُوا۔ خواہ وہ نادر شاہ سے آزادی ہو یا انگریزوں سے آزادی اور دہلی شاید ابھی

تک آزادی نہ حاصل کر سکا تھا۔ یا آزادی دہلی کو نہ پا سکی تھی۔ مذہبی تعصب کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ لیکن وقت بغیر کسی وقفہ کے گذر رہا تھا۔ سورج نکل آیا ویسی ہی آب و تاب سے، جیسے اس نے صدیوں پہلے اس طرح کے بہت سے واقعات دیکھے ہیں۔ جب ابن آدم وحشی تھا۔ حیوانیت کے خونی اوراق اس کی ہی کرنوں سے سپید اور سیاہ ہوئے تھے۔

صبح کو لوگوں نے ٹھہرنے کا انتظام شروع کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مقبرے میں اس کے نیچے کی کوٹھریوں دوسری اور دیگر منزلوں کی چھتوں کے نیچے اپنے اپنے سامان اور بستر جما دیئے کچھ لوگ لان میں چادروں کے خیمے تیار کرنے لگے دن چڑھتا گیا۔ اور پھر لوگوں کو خورد و نوش کی تلاش ہوئی۔ جس کے پاس چاول اور دال تھی۔ اس نے کھچڑی پکالی جس کو جو میسر آیا کھانے لگا۔ اور جہاں چاہتے گندگی پھیلاتے رہے آج انسان پھر اپنی ابتدائی زندگی کو لوٹ رہا ہے تاریخ کے اوراق پلٹے جا رہے تھے۔ وہ زمانہ جب صرف کھانے، رہنے، پہننے کی ضروریات تھیں جب قدرتی پھل جنگلی جانوروں کا گوشت کھانے کو میسر آتا تھا۔ بلکہ سب کچھ یہی تھا۔ جب کھال سے جسم ڈھکنا ہوتا تھا۔ آج یہ ضروریات بھی پوری ہوتی دشوار نظر آ رہی ہیں۔ کچھ ان میں ایسے لوگ بھی تھے۔ جو سارے ساز و سامان کے ساتھ بھاگے تھے۔ جن کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ بکس، پتیلیاں، اناج، خیمے، حتیٰ کہ گراموفون تک اپنے ساتھ لے آئے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کے تعلقات پولیس کے افسروں اور حکامِ دہلی سے تھے جنہوں

نے افسروں کی بار بار دعوتیں کیں تھیں۔ ان کے گھروں کو ڈالیاں بھیجی تھیں وہ حفاظت سے صرف فرنیچر کے نقصان کے علاوہ سب سامان لے آئے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو دفاتر میں نوکر تھے۔ جو بساط خانے کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں رکھتے تھے، جو کلرک تھے، جو مزدور تھے۔ جو افسروں کی نظر عنایت سے ہمیشہ محروم رہے تھے۔ آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی اب وہ اور بھی مفلس ہو گئے تھے۔ بھوکے تھے بے سروسامان تھے۔ ان کی خیریت پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ حکومت کے انتظامات کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا جس کو حکومت جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور تعصب و نفرت کی حکمرانی تھی۔ مگر وقتی تھی۔ کیونکہ نفرت کی حکمرانی انسانی محبت کو ختم کر دیتی ہے۔ محبت سے جہاں کا انتظام قائم ہے اخوت جب ختم ہو جاتی ہے جس سے انسانی ترقیاں وابستہ ہیں تو احساسات کو مردہ کر دیتی ہے جو انسانیت کی روح ہے۔

دوسرے دن راشن ڈیپارٹمنٹ کے افسران اور کارکن آئے چند ٹرک چاول اور دال کے بوروں سے لدے ہوئے ان کے ساتھ آئے سرکاری دفاتر مغربی دروازے کے سامنے کھول دیئے گئے۔ اناج کے بورے مقبرے کے سامنے مغربی دروازے کی کوٹھریوں میں کھول دیئے گئے۔ اور پھر لوگوں کو لائن لگا کر تین چھٹانک چاول اور ڈیڑھ چھٹانک دال تقسیم کی گئی۔ راشن لینے والوں میں تین دن کے بھوکے بھی تھے بچے بھی تھے جن کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئیں تھیں۔

اور وہ بھی شامل تھے جنھوں نے صبح ناشتہ کیا تھا جو جگہ کی وجہ سے پریشان تھے۔ شور و غوغا سے گھبرائے ہوئے تھے۔ اور افراتفری سے ناراض تھے اس جمِ غفیر میں سب سے زیادہ کس مپرسی اور قابلِ رحم حالت عورتوں کی تھی۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ترقی یافتہ مُلک ہے جہاں عورتوں پر جن کو تسکین دینے کے لئے پیکرِ صبر و رضا کہا جاتا ہے ہر طرح کے مظالم ٹوٹتے رہے ہیں۔ ہند کی تاریخ میں جہاں جہاں سیاہ دھبے نظر آتے ہیں۔ وہ عورتوں کے خون ہی سے بھرے ہوئے ہیں۔ مشرق کی رُوح کو زندہ رکھنے میں جس کے خون کی بھینٹ چڑھتی رہی ہیں۔ وہ بھی صنفِ نازک ہے ان فسادات نے پچھلے تمام بہیمیت اور حیوانیت کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اس سیاہی نے مساوات کے سُریلے نغمے میں درندگی کا شعور بھر دیا ہے۔ انسانیت کے چہروں پر گندگی مل دی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے واقعات نے شانتی اور عدم تشدّد کا بُری طرح سے مذاق نہیں اُڑایا۔ بلکہ ان کی روح کو مجروح کر دیا ہے جیسے ہم نے ترقی کی ہی نہیں تھی۔ ہم ہمیشہ سے تاریکی میں بھٹک رہے تھے۔

مقبرہ میں پانی کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ایک نل مقبرے کے مغربی دروازے کے قریب تھا جس کے پاس گندگی سے بھرا ہوا حوض تھا غلاظت میں لتھڑی ہوئی کلبلاتی ہوئی مخلوق تھی جس کا کوئی محافظ نہ تھا۔ صبح سے لوگوں کو لائن میں پانی لینے کے لئے کھڑا ہونا پڑتا۔ اور

جب تین چار گھنٹے کے بعد پانی بالٹی میں یا گھڑے میں مل جاتا تو دھکّوں ریل پیل سے گھڑے کا ٹوٹ جانا، بالٹی کا گر جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ زیادہ تر عورتوں سے گھڑے گر جاتے بالٹیاں اُلٹ جاتیں۔ اور پھر ان کی آنکھوں کی حالت دیکھنے سمجھنے کے لئے انسانی دل و دماغ ماؤف ہو جاتا کاش کوئی ہوتا۔ جو اس صنفِ نازک کی تکلیف پر مرہم رکھ سکتا۔ اُن کے آنسوؤں کو پونچھ سکتا جو میلے میلے دوپٹوں میں جذب ہو کر رہ جاتے۔ کوئی بھی ان گوہروں کی قیمت نہیں جانتا۔ کوئی بھی ان کی سوزش محسوس نہیں کرتا۔ جیسے عورت اور اشک افشانی لازم ملزوم ہو گئے ہیں۔

قافلے مقبرے میں آتے رہے ایک قافلے کے بعد دوسرا قافلہ، انسانوں کا قافلہ، عورتوں اور بچوں کا قافلہ، دلّی کے لوگوں کا قافلہ، آس پاس کے رہنے والوں کا قافلہ، میواتی مسلمانوں کا قافلہ، اور یہ قافلے آتے ہی رہے اور پھر ایک دن حکومت نے ہمایوں کے مقبرے میں قافلوں کی آنے کی ممانعت کر دی اب یہاں ریلیف ورکرز نے راشن تقسیم کرنے کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا جس میں دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے طلبا مجلسِ احرار دہلی کے کارکن شامل تھے صفائی کے محکمہ نے گندگی دُور کرنے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا مگر صفائی دُشوار معلوم ہو رہی تھی۔ کیونکہ دہلی گندگی سے بھرا پڑا تھا۔ ظاہرا ہی نہیں بلکہ دل کی غلاظتوں میں لتھڑا ہوا تھا۔ گندگی رُوح میں بسی جا رہی تھی۔

ایک روز آسمان پر بھی دھواں چھا گیا۔ کالے کالے خوفناک بادل مشرق سے اُٹھنا شروع ہوئے۔ تیز تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ آسمان سیاہ ہو گیا۔ پھر ٹوٹ ٹوٹ کر بارش شروع ہو گئی۔ یہ گھٹائیں آگ کو بُجھا دیں گی۔ انسانی دلوں کی سیاہی کو دھو دیں گی۔ مگر یہ توقع غلط تھی۔ مصیبت زدوں کے لئے ایک اور تکلیف بڑھ گئی۔ مقبرے میں وہی لوگ پناہ لینے آئے تھے جن کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملی تھی۔

غدر ۱۸۵۷ء میں جب باغیوں نے لال قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ تو بادشاہ ظفر مع اپنے خاندان کے رات کے وقت چور دروازے سے فرار ہوئے اور اسی مقبرہ ہمایوں ہی میں پناہ لی۔ اپنے دادا ہمایوں کی قبر سے لپٹ لپٹ کر خوب روئے دل ہلکا کیا۔ لیکن مقبرہ ہمایوں سے بھی شہزادے نکالے گئے ان کے ہتھکڑیاں لگیں۔ مقبرے سے قریب دو میل دُور دہلی کی طرف لے جا کر شہزادوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ پھر بہادر شاہ گرفتار کئے گئے۔ اور ان کو مقبرہ سے نکال کر زینت محل میں قید کیا گیا۔ مقدمہ چلا اور رنگون بھیجے گئے۔ اب اسی مقبرہ میں ۱۹۴۷ء کے لاکھوں مظلوم مسلمان پناہ گزین بنے ہوئے ہیں۔

آسمان سے پانی برس رہا تھا۔ لوگ جو مقبرے کے چاروں طرف خیموں یا چادروں کے نیچے تھے بھیگ رہے تھے۔ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کوئی چھت نہ تھی۔ سوائے آسمان کے جس پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پانی تیز ہو گیا تھا۔ لوگ بھاگ بھاگ کر مقبرہ میں، برجوں میں،

جہاں بھی چھت ملی چھپنے لگے۔ پھر بھی کافی تعداد بھیگ رہی تھی۔ بچے خاموشی سے اپنے والدین کو تک رہے تھے۔ جو لاچار و مجبور تھے۔ دوشیزاؤں کے گانے جو برسات میں عام تھے بند تھے۔ اور وہ پھٹی پھٹی میلی آنکھوں سے اپنے ماں باپ بھائی بہن کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے جیسے طوفان نوح آنے والا ہے۔ کون جانے سورج کب ڈوبا۔ رات کی سیاہی نے قیامت ڈھائی۔ مصیبت زدوں کے لئے رات کی تیرگی کوئی خاص بات نہ تھی کیونکہ ان کی زندگی کی صبح ہونے نہ پائی تھی۔ کہ سیاہی چھا گئی۔ مگر یہ رات جیسے ہزاروں راتوں کی ظلمت کو لئے ہوئے آئی تھی۔ آدمی مر رہے تھے۔ اور بارش ہو رہی تھی۔ تاکہ اناج پیدا ہو اور سوکھے کھیت لہلہا اٹھیں۔ مگر کس لئے؟ جب انسان نہ ہوگا پھر یہ بارش کیوں ہو رہی ہے۔ عقل و خرد نے انصاف کرنا چھوڑ دیا تھا زندگی میں کوئی توازن نہ تھا۔ مگر یہ لوگ خاموش تھے جیسے یہ تکالیف ان کی اپنی غلطیوں کی پاداش ہیں جیسے وہ گناہوں کی سزا پا رہے ہیں۔

بارش قریب ۴۸ گھنٹے سے زائد ہوئی اور پھر تھم گئی۔ بادل چھٹ گئے دھوپ نکل آئی لیکن جمنا میں طوفان آ گیا تھا لہریں مقبرے کی چار دیواری سے ٹکرا رہی تھیں جمنا کے قرب وجوار کے گاؤں یا تو بہہ گئے تھے۔ ان گاؤں والوں نے اپنے ہمسایوں کو گھروں سے نکالا

تھا۔ اور آج وہ خود موت سے دوچار ہو رہے تھے۔ لوگ مقبرے کی سب سے اُونچی چھت پر چڑھ کر دیہاتیوں کو بہتا دیکھ رہے تھے کچھ لوگ خوش تھے انھیں اس خوفناک منظر سے تسکین ہو رہی تھی۔ ان کا انتقامی جذبہ پورا ہو رہا تھا۔ وہ خدا کے انصاف کے ممنون تھے۔ کچھ لوگ ان تباہ شدہ گاؤں کے بھی تھے جو عجیب یاس و حسرت سے اپنے کھیتوں کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ ان کی تباہی نہیں چاہتے۔ جیسے اب بھی انھیں اپنی زمینوں سے محبت ہے۔

بارش اور غلاظت نے مل کر انسان پر آخری وار کیا۔ مقبرے میں ہیضہ پھیل گیا۔ بھوکوں کو ہیضہ ہو رہا تھا۔ مقبرہ کا سینہ چاک ہو گیا تھا۔ وہی ان کو پناہ دے رہا تھا۔ وہی جس نے ہمایوں کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا ہے۔ آج معمولی معمولی آدمیوں کو اپنی آغوش میں کھینچے لے رہا تھا۔ انسان زندگی کی تلخیاں نہ سہہ سکا۔ اور خاموشی سے موت کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔۔۔ موت قہقہے لگا رہی تھی، اجل کے بازار میں گودیاں اُجڑ رہی تھیں، سُہاگ اُجڑ رہے تھے۔ بوڑھے ماں باپ کے سہارے لُوٹ رہے تھے، موت بھائیوں کو بہنوں سے اور بہنوں کو بھائیوں سے جُدا کر رہی تھی، ایک ہُو کا عالم تھا۔ اور آج انسان اور۔۔۔ اس کا حُسن مر رہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کی فریاد سُنے، کوئی نہیں جو اس کی مدد کرے، مقبرے کا دل زوروں سے دھڑک رہا ہے انسان اس کے سینہ میں گھسے چلے

جا رہے ہیں۔ پہلو میں لپیٹے جا رہے ہیں خاموشی سے بے بسی سے، موت ہی ان کا سہارا ہے۔ انسانی درندگی سے بچنے کے لئے مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے موت آخری اُمید ہے۔

کئی مہینے کے بعد مقبرہ پھر سوچ رہا ہے۔ اب پھر یہاں ویرانی ہے اب پھر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ وہ کب تک انسانوں کو پناہ دیتا رہے گا۔ کب تک اپنی چھاتی سے لگاتا رہے گا۔ کیا یہ سیاہی نہ ہٹے گی۔ کیا یہ ظلمت ہی ظلمت رہے گی؟ اور پھر تاریکی دور ہوتی جاتی رہی ہے۔ فضا میں مہک سی پیدا ہو چلی ہے۔ دور کرن پھوٹتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ جیسے یہ دُنیا بدل رہی ہے جیسے انسان پیدا ہو رہا ہے تاریکی سے پرے ظلم سے پرے حیوانات سے پرے۔

مقبرہ اب بھی خاموش ہے اب اس میں پناہ گزین نہیں رہے بہت سے چلے گئے کچھ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ کچھ انسان کے ظلم کا شکار ہو گئے۔ اب مقبرہ ہے اور سیّاح ہیں جو آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ان سیّاحوں میں مرد بھی ہیں اور خوبصورت عورتیں بھی معصوم بچے بھی۔ کسی کو یقین نہیں آتا کہ چند برس پہلے اس میں تین لاکھ پناہ گزین مقید پڑے ہوئے تھے۔

برباد شہزادی کی خانہ آبادی

۱۴ دسمبر ۱۸۵۷ء کو شگفتہ بانو بنت مرزا مغل ابن بہادر شاہ بادشاہ دہلی اپنے باپ اور دادا کے ساتھ لال قلعہ سے بھاگ کر ہمایوں کے مقبرے میں آئیں۔ ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اور ان کی گود میں سال بھر کی ایک لڑکی بھی تھی۔

جب بہادر شاہ گرفتار ہو گئے اور مرزا مغل مارے گئے۔ تو شگفتہ بانو اپنی لڑکی کو لے کر بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں چلی آئیں۔ اور یہاں سے ان کو ایک ایسی ریاست کا باشندہ جو انگریزی فوج کا افسر تھا اپنے ہمراہ لے گیا۔ شگفتہ بانو فوجی افسر کے ساتھ اپنی خوشی سے گئیں تھیں کیونکہ ان کو دہلی میں اب زندگی کا سہارا نظر نہ آتا تھا۔ اس فوجی افسر کا نام دلباز خاں تھا۔ اور شگفتہ بانو کی لڑکی کا نام لالہ فام تھا۔ دلباز خاں نے شگفتہ بانو سے نکاح کر لیا تھا۔ کیونکہ بیگم کے خاوند غدر میں قتل کر دیئے گئے۔

پانچ چھ سال شگفتہ بانو دلباز خاں کے ساتھ بہت اطمینان کی زندگی بسر کرتی رہیں۔ مگر ایک دن انھوں نے دلباز خاں کو جو اس

وقت ریاست مذکور کے علاقہ میں ناظم تھے۔ ایک مجرم عورت سے جو بیان دینے کے لئے ان کے گھر میں لائی گئی تھی۔ کچھ ایسی باتیں کرتے دیکھا جن پر شگفتہ بانو کو شک گذرا۔ اور جب دلباز خاں نے مجرم عورت کو رہائی دے کر بطور ماما کے نوکر رکھ لیا۔ تو بیگم کا شبہ پکا ہو گیا۔ اور گھر میں رات دن جھگڑے رہنے لگے۔

آخر ایک دن کچھ ایسے واقعات بیگم نے دیکھے جن کی برداشت ان سے نہ ہو سکی۔ اور اپنی بچی کو لے کر رات کے وقت اس گھر سے نکل گئیں۔

جس آبادی میں دلباز خاں رہتے تھے۔ وہاں اگرچہ ریاست کا نظامت خانہ تھا۔ مگر کچھ بڑی آبادی نہ تھی۔ بیگم پچھلی رات میں جنگل میں چھپی رہیں۔ اور صبح ایک گاؤں میں پہونچیں جس میں جاٹوں کی آبادی تھی۔ لالہ فام کو رات بھر گود میں رکھا تھا۔ اور کئی میل پیدل چلنا ہوا تھا جس کی بیگم کو عادت نہ تھی۔ اس لئے ان کو بخار ہو گیا۔ اور وہ گاؤں کے پاس ایک شوالے کے چبوترے پر لیٹ رہیں لالہ فام کو بھوک لگی۔ اور اس نے رونا شروع کیا شگفتہ بانو کے پاس دو طلائی کڑے تھے۔ جن کو انھوں نے کپڑے میں باندھ رکھا تھا۔ گاؤں میں بنیئے کی ایک دوکان تھی جہاں بیگم اس بخار کی حالت میں بچی کو ساتھ لئے ہوئے گئیں اور ایک کڑا بنئے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہا۔ بنئے کو شبہ ہوا اور اس نے بیگم کے حالات پوچھنے شروع کئے۔

ابھی بات ختم نہ ہوئی تھی۔ کہ دلباز خاں گھوڑے پر سوار چند آدمیوں کے ساتھ بیگم کو تلاش کرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اور اس نے بیگم کو اس طرح بے پردہ کھڑا دیکھا۔ بیگم اس کو دیکھ کر کانپنے لگی۔ دلباز خاں نے کوئی بات نہ کی۔ مگر آدمیوں سے کہا اس کو پکڑ لو۔ اور اس طرح پیدل کھینچتا ہوا اپنے گھر پر لایا۔ مگر لالہ فام کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔

راستہ میں شگفتہ بانو عاجزانہ انداز میں کہنے لگیں۔ مجھے بخار ہے میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ پیدل نہیں چل سکتی" دلباز خاں نے دو تین کوڑے شگفتہ بانو کے مارے اور کہا "تیری یہی سزا ہے۔ تو شریف نہیں ہے بڑی کمین ہے جو بے پردہ گھر سے بھاگ گئی"

لالہ فام نے ماں کو پٹتے اور روتے دیکھا تو وہ بھی اماں اماں کہہ کر رونے لگی۔ مگر دلباز خاں کو ذرا رحم نہ آیا۔ اور وہ شگفتہ بانو کو اسی طرح پیدل نوکروں کے ذریعہ کھینچتا ہوا گھر پر لایا۔ گھر پہنچکر بانو کو غش آ گیا۔ غشی میں اس کے دانت کھلے ہوئے دیکھے وہ سمجھا کہ وہ ہنس رہی ہے اسی پر اس نے پھر کوڑے مارنے شروع کئے وہ ہوش میں آ کر ہاتھ جوڑنے لگی۔ لالہ فام نے بھی دلباز کے آگے ننھے ننھے ہاتھ جوڑے اور کہا میری اماں کو نہ مارو۔ مگر دلباز خاں یہی کہتا رہا "تو نے میری آبرو خاک میں آج پھر ملا دی۔ میں بھی تجھے خاک میں ملا کر چھوڑوں گا"

بانو نے کہا: "میں ہندوستان کے بادشاہ کی پوتی ہوں۔ مجھ پر ظلم نہ کرو اور خدا کے غضب سے ڈرو۔" یہ سن کر دلباز خاں نے شگفتہ بانو کے ایک ٹھوکر ماری جس کے صدمہ سے وہ تڑپنے لگی کیونکہ وہ حاملہ تھی۔ اور ٹھوکر اس کے پیٹ پر لگی تھی۔ بانو نے ہائے ہائے کرتے کرتے کہا: میری لالہ فام تجھے خدا کے سپرد کیا میں مری۔ میں چلی۔ ہائے میرا دم نکلا۔" یہ کہتے کہتے شگفتہ بانو مر گئیں۔ اور لالہ فام ماں کو چمپٹ کر اور بیتاب ہو کر رونے لگی۔

دلباز خاں نے دیکھا یہ تو مر گئی تو اس کو بہت ڈر ہوا کہ کہیں میں خون کے مقدمہ میں پکڑا نہ جاؤں اس لئے اس نے نوکروں سے کہا کہ اس کو جلدی کہیں دبا دو۔"

ایک نوکر نے بگڑ کر کہا۔

"عورت ذات کو اس طرح مارنا بہت بری بات ہے" دلباز خاں نے خفا ہو کر جواب دیا۔"

تو کون بیچ میں بولنے والا؟ چپکا رہ ورنہ تجھ کو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

نوکر کو اس بات پر ایسا طیش آیا کہ اس نے بہت زور سے ایک لکڑی دلباز خاں کے سر پر ماری جس سے دلباز خاں چکرا کر گر پڑا اس کا دماغ پاش پاش ہو گیا اور وہ فوراً مر گیا۔

اتنے میں پولیس آ گئی اور دونوں لاشیں سکھ قاتل سمیت قبضہ

میں لے لیں سکھ کو تین سال قید کی سزا دی گئی۔ اور لالہ فام کو دلباز خاں کا ایک رشتہ دار اپنے گھر لے گیا۔

لالہ فام سات برس کی تھی۔ اس کی صورت بہت اچھی تھی۔ مگر رنگ ذرا سانولہ تھا۔ دل باز خاں کے رشتہ دار نے اس کو گھر میں لے جاکر بیوی کے سپرد کیا جو بڑی ہی سنگ دل عورت تھی۔ بچاری لالہ فام سے چکی پسواتی۔ اور اس سے نہ پیستی تو اس کے طمانچے مارتی بیلوں کا گوبر پتھواتی۔ اور لالہ فام نہ تھاپ سکتی۔ تو اس پر پھر مار پڑتی لالہ فام کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور وہ اپنی ماں کو یاد کرکے روز صبح وشام چھپ چھپ کر رویا کرتی تھی۔ وہ گھر والی عورت کی شکل سے کانپتی تھی جہاں اس نے پکارا اری للو اور یہ فوراً بھاگی ہوئی اس کے پاس پہونچتی اور کہتی ” ہاں بیوی جی کیا حکم ہے“ عید کے دن گھر والی عورت نے لالہ فام کو بھی کپڑے پہنائے مگر وہ بہت ادنی درجہ کے تھے۔ لالہ فام نے کہا ” بیوی جی پاجامے میں پیوند لگادو۔ یہ ذرا پھٹا ہوا ہے“ عورت نے زور سے ایک طمانچہ مارا اور کہا ” دیکھتی نہیں آج مجھے پیوند لگانے کی فرصت ہے؟ جیسا ہے پہن لے“ لالہ فام آنکھوں میں آنسو لاکر سہم گئی اور پھر کچھ نہ کہا۔ مگر اس نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ ہم شہنشاہ ہندوستان کی اولاد ہیں اور عید کے دن ہمارے ہی گھر سے ہزاروں محتاجوں کو کپڑے تقسیم ہوتے تھے۔ اس لئے

اس نے خُدا کے سامنے ہاتھ جوڑے اور یہ کہا۔

"اللہ میاں میری اماں ابا کو بھیجدو۔ یہ عورت مجھے مارتی ہے۔ اور کوئی بھی مجھے نہیں بچاتا۔ اور اماں سے کہنا کہ وہ اچھا سا پاجامہ لیتی آئیں۔ آج عید ہے اور میرا پاجامہ پھٹا ہوا ہے"۔

یہ کہہ کر لالہ فام باہر آگئی اور اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اب دروازہ کھُلا اور اب اس کے ماں باپ آئے۔ مگر جب دیر ہو گئی اور کوئی نہ آیا۔ تو اس نے گھر والی عورت کی آنکھ بچا کر دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل گئی۔ کہ اللہ میاں نے شاید اماں کو بھیجا ہو وہ اسی خیال میں قبرستان تک پہونچ گئی جہاں اس کو ایک فقیر ملا اور اس سے باتیں کر کے رونے لگا۔ اور پھر اپنے ساتھ اس کو کہیں لے گیا۔

دس برس کے بعد ایک دیسی ریاست میں ایک شاہ صاحب ٹھہرے ہُوئے تھے۔ اور ان کی زیارت کے لئے ہندو مسلمان جوق در جوق چلے آتے تھے یہاں تک کہ والئی ریاست بھی آیا اور تخلیہ میں اپنے دُکھ سُکھ کا حال کہا شاہ صاحب نے تعویذ دے کر کہا "میں بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے خاندان سے ہوں۔ اور میرے ساتھ بہادر شاہ کی پوتی بھی ہے جس کو میں نے لکھایا پڑھایا بھی ہے۔ اور بہت نیک خصلت بھی ہے۔ اور اس کی عمر سترہ سال ہے اگر آپ کی شادی نہ ہوئی ہو تو اس سے شادی کر لیجئے۔

والئی ریاست نے کہا "میری شادی تو ابھی نہیں ہوئی۔ مگر

میں اپنی والدہ سے صلاح کر کے جواب دُوں گا۔"

دُوسرے دن والی ریاست کی والدہ لڑکی کو دیکھنے آئیں۔ اور پسند کر کے واپس گئیں۔ اور پھر چند روز کے بعد لالہ فام کی والیِ ریاست سے شادی ہو گئی۔ اب وہ اس رئیس کی چاہتی اور تاجدار بیگم ہے اور رئیس لالہ فام کی لیاقت تمیز داری تعلیم و تربیت کی خوبیوں اور صورت شکل کے سبب اس کا غلام بنا ہوا ہے۔

مگر جب عید آتی ہے تو لالہ فام اپنے پھٹے ہوئے پاجامہ کو نکلوا کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے "آدمی کو اپنی مصیبت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے" اور اس نے اپنی ماں کی قبر بھی جو دوسری ریاست میں تھی پکی بنوا دی ہے اور کئی بار اس کی زیارت کو جا چکی ہے ؛؛

بہادر شاہ کی غُربا نوازی

مُغل حکومت کے آخری تاجدار بہادر شاہ کا افسانۂ غم آپ نے اس کتاب میں پڑھ لیا۔ اور اسی کتاب میں مصوّرِ غم حضرت علّامہ راشد الخیری مرحوم دہلوی کی لکھی ہوئی سچی کہانیاں غدر کی ماری شہزادیاں بھی آپ نے پڑھی ہیں مصوّرِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم دہلوی کے لکھے ہوئے افسانے غدر ۵۷ء عیسوی کے متعلق بھی آپ نے پڑھ لئے ہیں اب آخر میں بہادر شاہ دہلی کی غربا پروری کا ایک سچا واقعہ بھی پڑھ جائیے۔

عبداللہ فاروقی

اب سے بتیس سال گذشتہ کی بات ہے میں فرید آباد کے جنگل

ہیں جو دہلی سے سترہ یا اٹھارہ میل آگرہ کی سڑک پر واقع ہے دریائے جمنا کے کھادر سے شکار کھیل کر معہ اپنے ہمراہیوں کے ایک کھیت کے کنوئیں پر پانی پینے اور آرام کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ ہمارے پاس کرمچ کا ڈول اور سوت کی ڈوری تھی۔ چنانچہ ہم لوگ پانی سے سیر ہو کر سگریٹ نوشی میں مشغول ہو گئے۔ اور پھر ایک ایک نے اپنے شکاری کارنامے بیان کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن میری توجہ سب سے الگ کھیت کے کاشتکار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ باوجود پیرانہ سالی کے اپنی خمیدہ کمر سے کھیت کی نلائی میں مصروف تھا۔ اور ایک پانچ چھ سال کا بچہ اس کے پاس کھڑا تھا شام ہونے میں ابھی دیر باقی تھی غالباً ہم لوگوں کی ہنسنے بولنے کی باتیں سن کر یا کام سے تھک کر وہ بڈھا اپنا کام چھوڑ کر کھیت سے اٹھا اور آہستہ آہستہ جھکا جھکا کھرپا ہاتھ میں لئے ہوئے ہمارے پاس آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا سانس ٹھکانے سے ہوا تو ہماری پارٹی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ کیا تم لوگ شکار کھیلنے آئے تھے؟ میں نے کہا ہاں بابا۔ بڈھے نے کہا کچھ شکار مل گیا؟ میں نے کہا۔ ہاں تین ہرن مل گئے ہیں وہ فرید آباد کی گاڑی میں بھیج دیئے ہیں۔ اب تیتروں کا شکار کھیلتے ہوئے فرید آباد چلے جائیں گے۔ بڈھے نے کہا۔ کیا تم فرید آباد رہتے ہو۔ میں نے کہا نہیں ہم تو دہلی رہتے ہیں۔ فرید آباد میں ہماری موٹر کھڑی ہے۔ وہیں ہم نے اپنے ایک آدمی کو گاڑی میں بٹھا کر ہرن روانہ کئے ہیں۔ اور وہیں خود بھی شکار

کھیلتے ہوئے پہنچ جائیں گے۔ میں نے بڈھے کاشتکار سے دریافت کیا۔ بابا تمہاری عمر کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ غدر میں نو دس برس کا ٹھاڑا اور ہوشیار تھا۔ مجھ کو غدر خوب یاد ہے۔ بلکہ غدر کے پہلے کی بھی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ میں نے کہا تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو۔ اور تم ابھی تک کھیت کیار کا کام کرتے ہو۔ تمہارے بیٹے پوتے تو بہت ہوں گے۔ مجھ کو تمہارے بڑھاپے میں کھیت کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔ تمہاری تو اب آرام کی عمر ہے بڈھے نے کہا۔ بیٹا مجھ سا بدنصیب کوئی نہ ہوگا۔ میرے کئی پوت جوان ہو کر مر گئے۔ بس ایک لڑکا تیرے جیسا جوان باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھوکوں مرتا لڑائی میں بھرتی ہو گیا تھا۔ وہ وہاں مارا گیا۔ جس کا یہ بالک میرے پاس کھڑا ہے۔ اس کی اور اس کی ماں کی چھ روپے ماہوار پنشن ہو گئی تھی۔ لڑکا مرنے کے بعد وہ کچھ دن تو یہاں رہی۔ جب تک پنشن ملتی رہی۔ اب وہ لڑکی دوسرے کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اس لونڈے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اب پنشن بھی بند ہو گئی۔ اب بیٹوں کی بہوؤں نے بھی تھوڑے دن بعد اپنا اپنا ٹھکانہ دوسری جگہ کر لیا۔ بس میرا اس بالک کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں نے کہا تمہاری ذات برادری اور گاؤں کے لوگ بھی کچھ مدد نہیں کرتے۔ میں اگر گاؤں کا تمہارے رہنے والا ہوتا۔ تو اگرچہ میں مسلمان ہوں تم ہندو خواہ کسی ذات کے ہو تمہاری ضرور مدد کرتا۔ اور تمہاری اس مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ بڈھے نے کہا بھگوان تجھے زندہ رکھے۔

تُو مجھ کو بھلے گھرانے کا معلُوم ہوتا ہے۔ بھیّا ہماری بستی والے اس جگہ سب دُکھی ہو رہے ہیں۔ اور جان سے بے زار ہو رہے ہیں۔ اور میں ان سے زیادہ بیزار ہوں میں نے کہا کیوں یہ کیا بات ہے۔ تمہارا گاؤں کا گاؤں پریشان ہے۔ اس نے کہا۔ بیٹا ہم لوگ ذات کے گوجر ہیں۔ ہم لوگ پیڑھیوں سے دہلی کے پاس پُرانے قلعہ میں آباد تھے۔ اور وہیں کی دھرتی جوتا کرتے تھے۔ اس میں بڑی اچھی پیداوار ہوتی تھی۔ لال مرچ تو اس دھرتی پر ایسی چرچری ہوتی تھی۔ کہ دہلی شہر میں پُرانے قلعہ کے نام سے مرچ بکا کرتی تھی۔ اور گاجر۔ مُولی۔ پیاز۔ اور دُوسری ترکاریاں خوب ہوتی تھیں۔ ہم کو قلعہ سے سرکار نے اُجاڑ دیا۔ جب سے ہم برباد ہو گئے۔

(۲) بڈھا اتنی گفتگو کے درمیان آنکھوں میں آنسو بھر لایا تھا۔ لیکن اب اس کا دم چڑھ گیا تھا۔ خاطر خواہ رو رہا تھا۔ اس کی حلقہ پڑی آنکھوں سے مسلسل آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں جن کے کچھ قطرے اس کے جھُریاں پڑے چہرے پر رُک کر اس کے تمام چہرے کو تر بتر کر رہے تھے، بڈھے کو روتا دیکھ کر بچہ بھی بے اختیار ہو کر کھڑا ہوا رو رہا تھا۔ جس کے سر پر بڈھا شفقت سے ہاتھ پھیرتا تھا اور رونے کے درمیان چُمکار بھی دیا کرتا تھا۔ ہماری پارٹی کے ہر بشر کا دل بھر آیا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے آنسو پلکوں پر چھلک رہے تھے۔ جن کو ہم سب لوگ رومالوں سے پونچھ رہے تھے۔ ہمارے ساتھی اور میں اب سب چہل پہل بھول گئے تھے

اور دل بے چین ہو گئے تھے۔ بچے کو میں نے بھی چمکارا۔ اور کچھ پیسے دیئے اور بڈھے سے بھی کہا۔ بھگوان تم پر رحم اور دیا کرے اور تمہاری تکلیفوں کو دور کرے۔ بڈھے کے بھی اب آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اور اس کا دل کچھ سنبھل گیا تھا۔ بڈھے نے اب یہ کہنا شروع کیا۔ غدر سے پہلے ہمارے پرانے قلعہ کی دھرتی میں باجرا بہت اچھا پیدا ہوتا تھا۔ اور میں بھی آدھی دھرتی میں ترکاری اور آدھی میں باجرا بوتا تھا۔ کیونکہ سرکاری باقی اب برابر بڑھتی جاتی تھی۔ ترکاری بونے میں فائدہ بہت ہوتا تھا۔ اور پیشگی نقد دام آجاتے تھے۔ مگر باجرے کی کھیتی سے زیادہ اس میں دن رات ٹہل کرنی پڑتی تھی۔ اور یہ ساری محنت سرکاری باقی کے خوف سے کیا کرتے تھے میں نے کہا۔ غدر سے پہلے پرانے قلعہ کی زمین پر کیا باقی تھی۔ بڈھے نے کہا۔ غدر سے پہلے ایک پیسہ بھی بادشاہی باقی کا ہم پر نہ تھا۔ بادشاہ سلامت کے کبوتروں کے واسطے ہل پیچھے سوا سیر باجرہ دینا پڑتا تھا۔ بس ہم پر یہی سرکاری لگان تھا۔ ہماری گوجروں کی قوم بہت بدمعاش ہے ہم لوگوں کے دل میں ایک دفعہ شرارت ہوئی اور بادشاہ سلامت کے کبوتروں کو باجرہ بھی نہ دینا چاہا۔ بات یہ تھی کہ اس سال برکھا کچھ کم ہوئی تھی۔ پیداوار بھی اچھی نہ ہوئی تھی۔ اگر ہم سب بادشاہ سلامت سے معافی مانگتے۔ تو معاف ہو جاتی۔ مگر ہم لوگوں کو ایک چال سوجھی باجرے کے پودوں پر سے بالیں کاٹ ڈالیں۔ اور خالی پودے کھیتوں میں کھڑے رہنے دیئے۔ اور سارے پرانے قلعہ والے کسان لال

قلعہ کے جھرونکوں کے نیچے جا پڑے۔ اور بادشاہ سلامت سے فریاد فریاد کا غل مچایا۔ ہمارا شور و غل سن کر جہاں پناہ جھرونکوں میں آئے اور کہا کیا فریاد لیکر آئے ہو۔ گوجروں نے کہا جہاں پناہ اس مرتبہ کھاری باؤلی کے بنیوں نے ایسا باجرے کا بیج دیا ہے کہ پیڑ تو خوب اُگ آئے اور ہرے بھرے نظر آنتے ہیں۔ لیکن بال ایک بھی نہیں آئی ہم پر اس مرتبہ کبوتروں کا باجرہ معاف کیا جائے۔ جہاں پناہ نے حکم دیا ہم خود موقعہ پر آکر کھیت ملاحظہ کریں گے۔ اور پھر حکم دیں گے۔

چنانچہ دوسرے دن شام کو بادشاہ سلامت خود ہوادار میں سوار ہوکر پُرانے قلعہ آئے۔ اور کھیت ملاحظہ کرکے اس فصل کا کبوتروں کا باجرہ بالکل معاف کر دیا۔ اور کھاری باؤلی کے بنیوں کو بُلاکر دھمکایا کہ تم نے ایسا خراب باجرہ کیوں دیا۔ آئندہ ایسا خراب باجرہ نہ فروخت کرنا ہماری قوم کے بعضے بعضے سمجھدار لوگ اس بات میں شریک نہ تھے۔ گھروں میں بُخار کا بہانہ کرکے چھُپے بیٹھے رہے۔ اور بادشاہ سلامت کے رو برو نہیں آئے۔ کیونکہ ان کو یہ خوف تھا کہ بادشاہ سلامت ایسے نادان نہیں جو ہماری چال نہ سمجھ جائیں گے۔ مگر حقیقت میں وہ نادان اور بھولے نہ تھے بلکہ رعایا پروری کرتے تھے۔ انھوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ اور باجرہ معاف کر دیا۔ آدمی انتر ہے کوئی ہیرا ہے۔ کوئی کنکر ہے دُنیا میں سارے منش سارے راجہ ساری پرجا ایک سی نہیں ۱۱۱

(۳) ایک دفعہ بادشاہ سلامت کی ایک بات سُناتا ہوں۔

اُس وقت میری سات آٹھ سال کی عمر ہوگی۔ اس سال برکھا بہت ہی کم برسی، گیہوں بیس بائیس سیر کے ہوگئے تھے۔ رعیّت بہت دکھی ہوگئی تھی اور بہت پریشان تھی۔ شہر کے ورے پرے کے گاؤں کے لوگ جمع ہوکر لال قلعہ کے جھروکوں کے آگے جا پڑے اور فریاد کی جہاں پناہ عالم پناہ سلامت رعایا بھُوکی مر چلی ہے جان سے تنگ ہے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں کو ڈانٹا جائے کہ وہ ناج سستا کریں۔ اگر تھوڑے دنوں اور ایسی حالت رہی تو حضور کی رعایا برباد ہو جائے گی۔ حکم شاہی ہوا کہ چوبدار کھاری باؤلی کے بڑے بڑے آڑتیوں کو حضور میں لاکر حاضر کریں چنانچہ آڑتی دیوان عام میں حاضر ہوئے سارے درباری اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اور رعیت کے مُکھیا حاضر تھے۔ میرا دادا الوانی سنگھ پرانے قلعہ کے مکھیوں میں تھا۔ وہ بھی دربار میں گیا تھا۔ وہ گھر کے بالکوں کو بادشاہوں کے قصّے سُنایا کرتا تھا۔ اس نے شاہِ عالم بادشاہ کو بھی دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی نمک حرام غلام قادر نے نکالی تھیں۔ سارے قلعہ اور شہر میں کہرام مچ گیا تھا۔ دربار کے امیروں کی شرارت سے یہ کام ہوا تھا۔ رعیت کے لوگ تو اس خبر کو سُن کر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ میرے بابا نے تین بادشاہتیں دیکھی تھیں۔ وہ غدر سے کچھ دن پہلے ہی مرا تھا۔ شام ہوگئی ہے ابھی مجھ کو اپنے واسطے اور اس بالک کے واسطے روٹی پکانی ہے۔ ادھر تمہارے شکار میں ہرج ہو جائے گا۔ اور فرید آباد اویرے پہونچو گے۔

نہیں تو اپنے بابا کی کہی اور اس کی آنکھوں دیکھی اور باتیں بھی سُناتا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آڑھتی دربار میں آئے۔ تو جہاں پناہ نے خود ان سے دریافت کیا کہ پچھلے سال بارش بہت کافی ہوئی تھی۔ ناج بہت پیدا ہوا تھا۔ اب کے سال پانی میں ذرا کھچاؤ ہوا ہے۔ تم نے کال ڈال دیا۔ غضب خدا کا دو تین من کے گیہوں کا بھاؤ تم نے گھٹاتے گھٹاتے بیس بائیس سیر کر دیا۔ رعایا بھوکی مرتی۔ فریاد نہ کرے تو کیا کرے۔ ایک من سے گیہوں کا بھاؤ ہرگز نہ کم کیا جائے۔ چنانچہ جہاں پناہ کے حکم سے بنیوں نے گیہوں کا بھاؤ ایک من کا کر دیا۔ لیکن جب ساری برسات بُوندا باندی میں ختم ہونے کو آ گئی۔ اور کوئی اچھا مینہ نہ پڑا۔ تو اب بنئے فریادی ہو کر پہونچے کہ حضور جہاں پناہ کے حکم سے ہم نے اب تک ایک من کے گیہوں بیچے اب ہم میں گنجائش نہیں رہی ہم بھی حضور کی رعایا ہیں۔ اور حضور کے اقبال سے بال بچے رکھتے ہیں۔ ہمارا دیوالہ نکل گیا۔ تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ غلّہ کی آمد بالکل بند ہو گئی ہے۔ ہم لوگ گھاٹے سے بیچ رہے ہیں۔ جہاں پناہ نے پھر ایک من کے گیہوں فروخت کئے جانے کا حکم منسوخ کر دیا۔ اور دربارِ عام میں حکم دیا کہ کل مابدولت عیدگاہ کے پاس کھیتوں میں جا کر خدا سے مینہ کیواسطے دعا کریں گے کہ رعایا کی تکلیف سے ہم بہت بے چین ہیں۔ اور پریشان ہیں۔ یہ حکم بجلی کی طرح شہر کے ہر کوچے اور محلہ میں اور شہر کے قریب کے دیہات میں پہنچ گیا۔ صبح ہوتے ہی خلقت کے غول شہر اور باہر سے عیدگاہ کی طرف جاتے شروع

ہوگئے۔ چھوٹے بڑے، مرد عورت، بچے بوڑھے کیا ہندو کیا مسلمان، بھنگی چوڑھے چمار، امیر کبیر سیٹھ فقیر سب ہی تو اس مقام پر دوڑ دوڑ بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے پرانے قلعہ کے سارے ہی تو آدمی وہاں پہنچ گئے تھے۔ کوئی ایک آدھ ہی بڈھا ٹھیرا اندھا دُھندا باقی رہ گیا تھا۔ لنگڑے لولے بھی جو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ لکڑیاں ٹیکتے ہوئے یا اور لوگوں کی چڈھیوں پر چڑھ کر پہنچ گئے تھے۔ بہت ہی بڑا خلقت کا ہجوم تھا جیسے کوئی بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے آٹھ نو بجے کے قریب ہاتھیوں کے گھنٹالوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔

سوار پیادے ڈھول ڈھما کے اپنے اپنے قرینے سے آنے شروع ہوئے۔ پیچھے پیچھے سکھ پال میں بادشاہ بیگم سوار تھیں۔ وہ جہاں پناہ کے ہاتھی کے بالکل پیچھے تھیں۔ جن کے ساتھ جوان جوان کہاریاں خواجہ سرائے۔ اور حبشی عورتیں رنگ برنگ کی زردوزی وردیاں پہنے ہوئے تھیں۔ باتو خلقت میں غل و پکار مچ رہی تھی۔ کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ مگر بادشاہ سلامت کی سواری جوں جوں نزدیک آتی گئی سب خاموش ہوگئے۔ یہاں تک کہ بچوں کے رونے کی آواز بھی جاتی رہی۔ پھر بادشاہ سلامت مولابخش ہاتھی پر سے [illegible] نقیب نے آواز لگائی۔ جہاں پناہ عالم پناہ کی سواری آئی ہے۔ تیسرا ادب بجالاؤ۔ روبرو وہیں ایک کھیت میں بیلوں کی جوڑی سے ہل لگا ہوا تھا۔ جہاں پناہ نے بیلوں کی رسی پکڑ کے ان کو دو ایک قدم

سانٹے سے ہنکا کر چلا یا اور اسی کھیت میں بوریہ پر نماز پڑھی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر دعا مانگی۔ اپنے بادشاہ کو آبدیدہ دیکھ کر ساری خلقت کے آنسو بھر آئے۔ لوگ زار و قطار رونے لگے۔ پھر بادشاہ بیگم برقعہ اوڑھ سر پر روٹی کی ڈلیہ رکھے ہاتھ میں پانی کا کروا لئے بادشاہ سلامت کے پاس آئیں اور روٹی کی ڈلیا جس میں بھیجڑ کی روٹی اور ساگ کی بھاجی تھی۔ کروے سمیت بادشاہ کے آگے رکھدی بادشاہ سلامت نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر کھایا اور پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ بس پھر جو کالی کالی بھوری بھوری اودی اودی گھٹا آ کر جو برسنا شروع ہوئی تو لوگوں کو گھر پہونچنا مشکل ہو گیا۔ شہر والے تو جلدی سے اپنے گھروں میں پہونچ گئے ہوں گے۔ مگر دیہات والوں کی بڑی مشکل ہوئی۔ تھوڑی دور تک تو میں اپنے باپ کے ساتھ بھاگا بھاگا چلا۔ لیکن دلّی دروازے کے پاس بارش کا بہت زور ہو گیا۔ اور میں بھاگتے بھاگتے ہانپ گیا۔ تو میرے باپ نے مجھ کو اپنی پیٹھ پر سوار کر لیا۔ میں اس زمانہ کی باتیں یاد کر کر کے رویا کرتا ہوں۔ بس بھیّا اب تم جاؤ اور پھر آؤ گے تو اور باتیں سناؤں گا۔" بڈھے کی باتوں میں ہم سب ایسے محو اور از خود فراموش ہو گئے کہ شکار اور گھر سب بھول گئے۔"

میں نے بڈھے کو پانچ روپے دیئے اور کہا تمہاری دھوتی پھٹ رہی ہے اور تیار کرا لینا۔ بڈھا لینے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن میں برابر

اصرار کرتا رہا۔ اور روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھ کر جب میں نے اس کی مُٹھی اپنے ہاتھ سے بند کی تو وہ خاموش ہوگیا۔ ہم سب اس کو سَلام کرکے تیز تیز قدموں سے فرید آباد پہونچکر موٹر میں واپس دہلی آگئے۔

رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے

آخری ایّام

مغل تاریخ کا آخری ماتم

دو اسباب . احمد اعظم مقدم . شہزادے ماموں
دو یادگاریں . سرکاری احتساب . رنگون میں آمد
شاہی قید خانہ . آخری دن . جوان بخت
رحیم بخش کبابی . ملکہ زینت محل . جمشید بخت
رونق زمانی بیگم . کلثوم زمانی بیگم . حافظ محمد ابراہیم دہلوی

(از مولانا محمد ابراہیم صاحب مظاہری)

کتنی عجیب بات ہے کہ ہندوستان پر نو سو ۹۰۰ سال تک حکومت کرنے والے خاندان کا آخری غم نصیب بادشاہ جب دلّی سے گرفتار کرکے رنگون بھیجا جاتا ہے تو مغلیہ تاریخ یہیں دم توڑ دیتی ہے اور مؤرخ کے قلم کی سیاہی یہیں خشک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد نواسی ۸۹ سال کے بادشاہ نے رنگون میں چار پانچ سال کیسے گذارے کیسی بیتی؟ اور کن حالات میں موت آئی؟ بہادر شاہ کی زندگی کا یہ آخری حصہ ابھی تک نامکمل ہے۔ بلکہ اب تو یہ واقعہ اتنا پرانا ہو گیا کہ موجودہ نسلیں یہ بھی نہیں جانتیں کہ دہلی کا معزول اور مظلوم بادشاہ رنگون میں کسی زمانے میں قید تھا۔ اور اس نے بدھ مت کے شوئیڈگون پگوڈا کے دامن میں ایک دو منزلہ لکڑی کے مکان میں دم توڑا تھا ——— میں عام طور پر تاریخ مغلیہ کے مطالعے کے وقت یہ تشنگی محسوس کرتا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد جب بہادر شاہ کو انگریزوں نے قید کرلیا۔ اور برائے نام اور پنشن خوار بادشاہ کی حیثیت بھی ختم ہو گئی تو اس کے بعد انہیں رنگون بھیج دیا رنگون پہنچنے کے بعد کے حالات تاریخوں میں نہیں ملتے۔ دلّی سے روانگی سے لیکر رنگون پہنچنے کے بعد سے موت تک کے واقعات کے متعلق تاریخ بالکل خاموش ہے۔ بلکہ مغلیہ تاریخ کا یہ حصہ نامکمل ہے۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود کوئی مستند اور کارآمد چیز دستیاب نہیں ہوئی۔

دو اسباب

بہادر شاہ ظفر کے بارے میں مسلمانوں کی لاعلمی کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو مسلمانوں میں سیاسی شعور کی کمی، مسلمان سیاسی طور پر بہادر شاہ کے عہد میں تو کیا آج بھی پسماندہ ہیں جس وقت بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون لایا گیا تو اس وقت تک برما پورے طور پر تاج برطانیہ کے تحت نہیں آیا تھا۔ اور قدیم برمی دارالحکومت مانڈلے میں برما کا کمزور بادشاہ تھیبو حکومت کر رہا تھا۔ رنگون اس وقت چیف کمشنر کا ایک صوبہ تھا۔ لفٹنٹ گورنر بنگال کے ماتحت ۱۸۵۸ء میں یہ صوبہ آیا۔ کرنل سر آرتھر فیر چیف کمشنر تھے ان ہی کے نام سے آج رنگون کی ایک مشہور سڑک فیر اسٹریٹ (کلکتہ روڈ) مشہور ہے اور اسی سڑک کے سرے پر کلکتہ روڈ کی جیٹی سے ہندوستان کا مظلوم اور ضعیف العمر بادشاہ رنگون لایا گیا۔ ان دنوں یہاں جو مسلمان تھے وہ زیادہ تر ہندوستان سے آئے ہوئے تھے یہ مسلمان زیادہ تر تجارت یا ملازمت کے سلسلے میں آئے تھے۔ اس لئے ایک مظلوم بادشاہ کی سیاسی اہمیت کو لوگ نہ سمجھ سکے۔ سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ جو جانتے ہیں وہ بھی پوری طرح کچھ نہیں جانتے۔ دوسری یہ وجہ ہوئی کہ جب تک بہادر شاہ رنگون میں بقید حیات تھے ان کو کسی سے اور کسی کو

اِن سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ضعیفی کا عالم تھا۔ پچاسی سال کی عمر میں تو وہ رنگون پہنچے۔ اس عمر میں یُوں بھی انسان اپاہج ہو جاتا ہے۔ اس پر بہادر شاہ کو حکومت کے چھن جانے اور قید ہو کر رنگون پہنچنے کا افسوس تھا اس لئے بہادر شاہ کا تعلق باہر والوں سے بالکل نہیں تھا۔ وہ خود بھی باہر والوں سے ملنا نہیں چاہتے تھے اور انگریز بھی نہیں چاہتے تھے کہ باہر کے لوگ معزول بادشاہ سے راہ و رسم پیدا کریں۔ مبادا ان میں پھر بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

اس مقالے میں جو معلومات مُہیّا کی گئی ہیں اس کے دو ذرائع ہیں۔ ایک تو مسٹر احمد یوسف مداری منیجنگ ٹرسٹی درگاہ بہادر شاہ ٹرسٹ ہیں۔ مسٹر مداری زمانہ دراز سے اس مقبرے کے ٹرسٹ کے سکریٹری اس کے بعد وہ سن ۴۶ء سے منیجنگ ٹرسٹی ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس کبھی بہادر شاہ کے بارے میں مُستند مواد موجود نہیں۔ لیکن وہ کافی معلومات رکھتے ہیں اور ان سے اس مقالے کی تیاری میں بہت مدد ملی۔

احمد اعظم مقدم

دوسرا ذریعہ ۹۳ سالہ احمد اعظم مقدم صاحب ہیں۔ احمد اعظم مقدم صاحب غالباً رنگون کے اس وقت معمر ترین شخص ہیں۔ وہ بہادر شاہ ظفر کی وفات کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔ آبائی وطن راندیر ضلع سورت (صوبہ بمبئی) ہے مقدم صاحب نانا ملا موسیٰ جی اور ان کے بڑے

ماموں مُلّا یوسف رنگون کے مشہور تاجروں میں سے تھے اور ان کا ہندوستان آنا جانا ہوتا تھا۔ بہادر شاہ کی تاجپوشی کے وقت یہ دونوں دلّی میں تھے۔ مقدم صاحب کے ماموں مُلّا یوسف نے کوچہ چیلان دلی میں ایک شادی کی تھی اور ان کی یہ ممانی ملیح آباد کی رہنے والی تھیں۔ اس لئے دِلّی اور دلّی والوں سے مقدم صاحب اور ان کے آباؤ اجداد کے تعلقات تھے۔

شہزادے ماموں

جس وقت بہادر شاہ قید کر کے رنگون لائے گئے تو کرنل آرتھر فیر سے مقدم صاحب کے نانا ملّا موسیٰ جی کے تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ کرنل فیر نے مُلّا موسیٰ جی سے ذکر کیا کہ بہادر شاہ کو خارش ہو گئی ہے اس لئے ان کے علاج کے لئے کسی حکیم کو بُلایا جائے۔ یہ تھی پہلی ”تقریب بہرِ ملاقات“ جو بہادر شاہ اور ان کے قید خانے کے باہر کے کسی شخص سے ہوئی اس کے بعد سے کبھی کبھار مُلّا موسیٰ جی کا آنا جانا ہوتا رہا۔ شاہی خاندان سے یہ تعلق رہا اور بہادر شاہ کی وفات کے ایک سال کے بعد جب مقدم صاحب پیدا ہوئے تو چالیس دن کے بچے کو لے کر ان کی والدہ ملکہ زینت محل کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ملکہ نے اس بچے کو گود میں لیا۔ اس وقت شہزادہ جواں بخت کے بچے جمشید بخت کی عمر کوئی دو تین سال کی تھی۔ جمشید مرزا اور

احمد اعظم مقدم بچپن کے ساتھی تھے۔ شہزادہ جواں بخت کو مقدم صاحب اور ان کے خاندان والے شہزادے ماموں کہا کرتے تھے۔

دو یادگاریں

احمد اعظم مقدم اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ مقدم صاحب کی عمر اب اتنی ہو چکی ہیں کہ بقول خود ان کے ان کا دماغ اب سوکھ چکا ہے اور وہ تمام باتیں یاد نہیں رہیں۔ ان کے پاس ان کے نانا ملا موسیٰ جی کے کچھ کاغذات تھے جس میں بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کچھ معلومات تھیں۔ جو حکیم اجمل خاں مرحوم لے گئے۔ اور حکیم صاحب نے ان کاغذات کو مطالعہ کرنے کے بعد اس سلسلہ میں کافی ذخیرہ اخباروں میں شائع کیا تھا کچھ کاغذات دوسری جنگ عظیم کے دوران میں دستبرد زمانے سے غائب ہو گئے۔ اور بھولی بسری یاد کے سوا احمد اعظم مقدم صاحب کے پاس کچھ نہیں۔ ہماری محدود معلومات میں اب شاہی خاندان کا ایک فرد یعنی بہادر شاہ کا پڑپوتا سکندر بخت اور شاہی خاندان کی گود میں پلے ہوئے احمد اعظم مقدم ہی رنگون میں موجود ہیں اس کے سوا اور کوئی یادگار نظر نہیں آتی۔ خود بہادر شاہ کا مقبرہ۔ ان کی ملکہ زینت محل۔ شہزادی رونق زمانی بیگم اور جمشید بخت کی قبروں کے سوا کوئی چیز نہیں رہی۔ شہزادہ جواں بخت کی قبر کا بھی ٹھیک پتہ نہیں —— مولمین میں ان کا انتقال ہوا۔ اور اب وہاں بہت کم لوگ جانتے ہیں

کہ وہ دِلّی کا شہزادہ کہاں مدفُون ہے۔

سرکاری احتساب

احمد اعظم مقدم صاحب کا بیان ہے کہ انگریزوں نے قصداً بہادر شاہ کو یہاں کے لوگوں سے اس لئے دور رکھا کہ مُبادا ان میں بغاوت اور انقلاب کے اثرات پیدا ہو گئے تو پھر یہاں ایک نیا غدر پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ جب رنگون کی طوائفیں بہادر شاہ کی غزلیں گایا کرتی تھیں۔ خاص طور پر وہ غزلیں جس میں بہادر شاہ نے خود اپنی غربت اور حکومت کے زوال کی کہانی گُل و بُلبل کی زبان میں ادا کی تھی تو رنگون کے حُکّام نے طوائفوں کو روک دیا۔ اور تنبیہہ کی کہ وہ آئندہ سے ظفر کی غزلیں نہ گایا کریں۔

رنگون میں آمد

بہادر شاہ ظفر ۸ استمبر ۱۸۳۷ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ اور ۸۵ سال کی عمر میں ۱۸۵۸ء میں وہ شاہی قیدی کی حیثیت سے رنگون لائے گئے۔ بہادر شاہ کلکتے سے میکنن میکنزی کے دخانی جہاز سے رنگون آئے۔ اور کلکتہ روڈ (فیئر اسٹریٹ) کی جیٹی پر اُتارے گئے۔ گورا فوج کا زبردست پہرہ تھا — بہادر شاہ کے ساتھ ان کے خاندان اور اسٹاف کے ۳۵ آدمی تھے۔

جن میں سے صرف ملکہ زینت محل۔ شہزادہ جواں بخت۔ کلثوم زمانی بیگم۔ رونق زمانی بیگم اور ننھا شہزادہ جمشید بخت اور جواں بخت کے اُستاد حافظ محمد ابراہیم کا نام معلوم ہو سکا۔ دوسرے افراد کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھے اور کہاں رہے؟ کلکتہ روڈ کی جیٹی سے بادشاہ کو فٹن میں ان کی قیامگاہ پر پہنچایا گیا اور ملکہ اور خاندان کے دوسرے افراد کو بند گاڑیوں میں۔

شاہی قید خانہ

بہادر شاہ کی قیامگاہ یا ان کا قید خانہ موجودہ مکان میں ہے جہاں ان کا مقبرہ ہے۔ اس روڈ کا نام اس زمانے میں صدر بازار روڈ نمبر ۵۸ تھا۔ ۳۸ء میں مرحوم ایم ای داؤد جی وکیل نے میونسپلٹی میں تجویز پیش کی۔ اور اس سڑک کا نام صدر بازار روڈ سے بدل کر ظفر شاہ روڈ رکھ دیا گیا۔ لوگوں میں عام طور پر بہادر شاہ اپنے تخلص ظفر سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس لئے بہادر شاہ روڈ کی بجائے اس سڑک کا نام ظفر شاہ روڈ ہو گیا۔ یہاں ایک کوٹھی بنی تھی۔ اس کوٹھی میں بادشاہ اور خاندان کے افراد کو ٹھہرایا گیا۔ اور یہاں گوروں کی مسلح گارڈ دن رات پہرہ دیا کرتی تھی۔ بہادر شاہ کے قید خانے کے کمپاؤنڈ سے ملی ہوئی کوٹھی کیپٹن نیلسن ڈیوس کی تھی جو اس زمانے میں چیف کمشنر کرنل سر آرتھر فیئر کے چیف سیکرٹری تھے۔ کرنل فیئر نے

بہادر شاہ کی نگرانی کا کام بھی کیپٹن نیلسن کے سپرد کیا۔ آخر تک پنشن اور دوسرے تمام اخراجات کی ذمہ داری کیپٹن نیلسن پر تھی۔

آخری دن

بہادر شاہ ظفر نے دوران قید میں زندگی کے دن کیسے پورے کئے اس کی تفصیل تو نہیں ملتی۔ البتہ اتنا پتہ چلا کہ ایک تو ضعیفی اور دہلی والوں کا قتلِ عام پھر بادشاہت ہاتھ سے نکل جانے اور سب سے بڑھ کر غریب الوطنی کی زندگی کی وجہ سے وہ بڑی مایوسی کی زندگی گذار رہے تھے۔ جس وقت قید ہوئے اُس وقت بھی وہ عمر کی انتہائی سرحدوں پر پہنچ چکے تھے۔ رنگون کے دوران قید میں زیادہ تر بیمار رہے اور فالج کے حملے کے بعد تو ان کی حالت اور زیادہ خراب ہوئی۔ اور شاہ جہاں آباد کا یہ غریب الوطن معزول بادشاہ اپنے خویش و اقارب اور اپنے دارالحکومت سے دُور بڑی بیکسی کے عالم میں بروز جمعہ بوقت عصر ۱۴ جمادی الاوّل ۱۲۷۹ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو نواسی سال کی عمر میں جان جانِ آفریں کے سپرد کرتا ہے اِنّا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ پاس ملکہ زینت محل اور رونق زمانی بیگم کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ انگریزوں نے اتنی رازداری سے کام لیا کہ بہادر شاہ کی موت کی خبر بھی نہ پھیلے اس لئے وہیں دفن کا بھی انتظام کرایا۔ جواں بخت کے اُستاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی نے کفنایا اور جنازے کی نماز پڑھائی۔

احمد اعظم مقدم کے نانا مُلّا موسیٰ جی اور خود حافظ محمد ابراہیم نے بہادر شاہ کو قبر میں اُتارا۔ اور یہ دلّی کی امانت رنگون کی خاک میں سپرد کر دی گئی۔

جواں بخت

احمد اعظم مقدم صاحب کا بیان ہے کہ اس کوٹھی میں جس میں بہادر شاہ کو قید کیا گیا تھا سات یا آٹھ نفر رہتے تھے بادشاہ کی موت کے بعد ملکہ زینت محل اور رونق زمانی بیگم کے رہنے کا ٹھکانا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ شہزادے جواں بخت جو بہادر شاہ کے ساتھ رنگون آئے تھے ان کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ مولمین چلے گئے۔ مولمین میں جو نیا قبرستان ہے اس کے سامنے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ایک کوٹھی تھی۔ غالباً انگریزوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ جواں بخت اور بہادر شاہ ایک جگہ رہیں اس لئے جواں بخت کو مولمین بھیج دیا تھا۔ مولمین میں بھی شہزادے اور وہاں کے لوگوں میں کوئی تعلقات نہیں تھے۔ بلکہ اس مقالے کے لکھتے وقت جب میں نے وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا تو کوئی حال بتلانے والا نہیں ملا۔ یہاں تک کہ جواں بخت کی قبر پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ سنہ ۸۲ء ان کا انتقال ہوا۔ دُوسری جنگِ عظیم میں جب دوبارہ انگریز اور اتحادی برما میں داخل ہوئے تو کچھ لوگوں نے ایک سانولی رنگت کے ضعیف العمر

بڑے میاں اور ایک بڑی بی کو دیکھا جو ساڑھے بارہ روپے پنشن لینے کے لئے شہر مولمین میں آئے تھے۔ اس کے بعد کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کون تھے کہاں رہتے ہیں؟ اور اب وہاں شاہی خاندان کا کوئی فرد ہے بھی یا نہیں؟

رحیم بخش کبابی

احمد اعظم مقدم صاحب کو صرف اتنا یاد ہے کہ جب شہزادے جواں بخت رنگون آئے تو ان کا سن ۳۵ یا ۴۰ کے درمیان تھا۔ اور ایک آدھ بار لوگوں نے ان کو شہر میں جب کہ وہ سورتی مسجد (مغل اسٹریٹ) کے نیچے دلی والے رحیم بخش کبابی کی دوکان پر آتے تھے۔ جب کبھی وہ رحیم بخش کبابی کی دوکان میں آتے تو بہت لوگ شہزادے کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ شہزادے دیکھنے کی چیز تو رہ نہیں گئے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ اسی شہزادے جواں بخت کی شادی میں استاد ذوق اور غالب میں سہرا لکھنے پر بڑا مقابلہ ہوا تھا اور شہر دلی گونج اٹھا تھا ان دو استادوں کے سہروں سے۔ مگر اب؟

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب خاک جستجو کیا ہے

ملکہ زینت محل

شہزادہ جواں بخت کی ماں ملکہ زینت محل جنھیں بادشاہ کے مزاج میں بڑا

دخل تھا۔ وہ بادشاہ کی وفات کے بعد ۲۴ سال تک زندہ رہیں۔ اور ۱۴ شوال ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو رنگون میں ہی انتقال ہوا اور بہادر شاہ کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ ان کی بقیہ زندگی کے بارے میں بھی کوئی تفصیل نہیں مل سکی۔

جمشید بخت

جس وقت بہادر شاہ رنگون پہنچے تو اس وقت شہزادہ جواں بخت کے لڑکے جمشید بخت کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ احمد اعظم مقدم صاحب کا بیان ہے۔ کہ جمشید بخت اور ان کی عمر میں صرف تین سال کا فرق ہے ایک ساتھ کھیلے۔ ایک ساتھ بڑے ہوئے جمشید بخت نے رنگون کالج میں تعلیم حاصل کی۔ وہ بڑی صاف اور شستہ انگریزی بولتے تھے گھوڑا سواری کا شوق تھا۔ عام طور پر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہی باہر نکلتے تھے۔ رنگون سنٹرل جیل کے سامنے ایک لکڑی کے بنگلے میں وہ رہتے تھے۔ انھوں نے ایک شادی رنگون میں بھی ایک برمی مسلم خاندان میں کی۔ غالباً ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں انھوں نے شادی کی۔ اس سے ایک لڑکا سکندر بخت پیدا ہوا۔ وہی آج کل شاہی خاندان کی ایک یادگار ہے۔ جمشید بخت نے خود اپنے خاندان میں بھی شادی کی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے نواب پیارے مرزا کے خاندان کی وہ لڑکی تھی۔ اور یہاں

دوسری شادی کے بعد وہ بیوی وطن واپس ہوگئی۔ غالباً اس کے دو بچے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں رنگون میں جمشید مرزا کا انتقال ہوا۔ اس زمانے میں تحریک خلافت کا بڑا زور تھا۔ لوگوں نے چاہا کہ بادشاہ کے پوتے کو بھی اسی کے پہلو میں دفن کیا جائے لیکن حکومت نے پس و پیش کیا اور لوگوں نے تابوت قبرستان میں جمشید بخت کو دفن کر دیا۔

رونق زمانی بیگم

اس شہزادی نے ۳۰ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۹ھ مطابق ۳ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔

کلثوم زمانی بیگم

اس شہزادی کے بارے میں زیادہ تفصیل نہ مل سکی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ برمی چینی سرحد کے ایک جلاوطن چینی مسلمان شہزادے سے ان کا نکاح ہوا۔ لیکن بعد میں طبیعتوں میں تفاوت کی وجہ سے جدائی ہوگئی۔ شہزادی کی طبیعت اور چینی شہزادے کی طبیعت میں کوئی مناسبت نہیں تھی۔

حافظ محمد ابراہیم دہلوی

جواں بخت کے استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی نے بہادر شاہ

کی وفات کے بعد رنگون کی قصاپوری مسجد میں امامت کرلی۔ پہلے وہ یُوں ہی آتے جاتے رہے اور بعد میں وہ اُنیس سال تک مستقل امام رہے ان کے شاگردوں میں بچھتر سالہ حافظ محمد یوسف صاحب خطیب بنگالی جامع مسجد رنگون زندہ ہیں۔ حافظ صاحب نے ٹانگو (وسط برما کا شہر) میں شادی کرلی تھی اس سے دو اولاد پیدا ہوئی۔ اور دونوں کا اب انتقال ہوچکا ہے۔

یہ ہے تاجدار دہلی کے لُٹے ہوئے اور اُجڑے ہوئے خاندان کے بقیتہ السیف افراد کی نا مکمل اور تشنۂ تکمیل کہانی۔ تاریخ بڑی ظالم ہے وہ کسی پر رحم نہیں کرتی۔ بہادر شاہ اور ان کے ساتھیوں اور خاندان کا حال بھی ہماری سیاسی بے شعوری کی وجہ سے گمنامی کی نذر ہوگیا ؎

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

* * *

فرید حمید تحریر نمود

حیاتِ کلیم رح

ہندوستان میں جب مغل سلطنت پر شاہی خاندان کے اندرونی خلفشار اور روز بروز حکمرانوں کی تبدیلی سے جانکنی طاری تھی۔ سیاسی تغیرات کی وجہ سے مذہب کی روح فنا ہوتی جارہی تھی۔ ہر طرف مایوسی اور قنوطیت کا عالم طاری تھا تو قدرت نے قطب العالم شیخ المشائخ حضرت شیخ کلیم اللہ ولی شاہجہاں آبادی قدس سرہٗ کو مسندِ ارشاد پر بٹھایا اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے احیاء و تجدید کا سلسلہ شروع ہوگیا عوام کی اصلاح کے لئے حضرت شیخ المشائخ کے خلفاء ہند اور بیرون ہند میں پھیل گئے۔ رشد و ہدایت کے دریا بہنے لگے، اور حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی رح کے وصال کے بعد چشتیہ خانقاہوں میں جو خاموشی اور افسردگی طاری ہوگئی تھی حضرت شیخ رح کے درود مسعود سے جوش و حرارت میں تبدیل ہوگئی "ہو، حق" کے نعروں سے خانقاہوں کی دیواریں گونج اٹھیں۔

ہے بابِ اجابت در تیرا جب کی دمِ مشکل کوئی دعا × آئی ہوئی آفت آ کے ٹلی "یا شیخ کلیم اللہ ولی"

حضرت شیخ رح نے جب دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو اس وقت ملک کی کیا حالت تھی؟ امراء و خواص کس ڈگر پر گامزن تھے؟ اور عوام کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی؟ اور حضرت شیخ رح نے اس پُرآشوب دور میں کیا کیا تبلیغی خدمات انجام دیں، کس طرح زندگی بسر کی؟ حیاتِ کلیم رح میں ان تمام حالات پر پوری طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب جامعیت و انفرادیت کے پیشِ نظر سلسلۂ نظامیہ کے مریدین و متوسلین کے لئے حرزِ گلو بنا کے رکھنے کے قابل ہے کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ ٹائٹیل رنگین و دلکش، جس پر حضرت قطب عالم رح کے مزار مبارک کا فوٹو جاذب نظر ہے، مجلد قیمت ساڑھے تین روپے علاوہ محصولڈاک

آستانہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

بیاض الاولیاء

اولیائے کرام رح کے سو فی صدی مخصوص و مجرب اوراد و اعمال کا بے مثل و بیش بہا مجموعہ ہے جس میں آپ کو ہر مشکل کا حل اور ہر مصیبت کا علاج ملے گا۔ اللہ کے منتخب اور برگزیدہ بندوں کے دلوں سے جو لفظ بھی نکلتا ہے وہ زمین و آسمان میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے **بیاض الاولیاء** کتاب میں غوث الاعظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح شیخ الاسلام حضرت شیخ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رح۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ سلطان نظام الدین اولیاء محبوب الہی رح۔ فانی فی اللہ حضرت شیخ کلیم اللہ ولی شاہجہاں آبادی رح، راس المحدثین حضرت شیخ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح۔ رئیس الاولیاء حضرت شیخ مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی رح۔ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری رح۔ حضرت شیخ مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رح۔ حضرت شیخ محمد محدث تھانوی رح۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رح۔ اور دوسرے اساطین و مشاہیر امت کے آزمودہ اوراد و وظائف اور عملیات درج ہیں، جن عملیات اوراد و وظائف کو ان اکابر اولیاء اللہ نے اپنے معمولات میں رکھا ہو ان کی تاثیر سمندروں کو خشک کر سکتی ہے، اور پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے اگر آپ کو بھی ایسی کوئی دشواری درپیش ہو یا کوئی ایسی مشکل سامنے آ گئی ہو جو کسی طرح بھی حل نہ ہوتی ہو تو اللہ پر بھروسہ کر کے **بیاض الاولیاء** کے اعمال و اوراد کا تجربہ کیجئے۔ اگر آپ کسی دل پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ بیمار ہیں اور بیماری آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی اگر آپ کو دشمنوں نے ستا رکھا ہے اگر آپ دعا کرتے ہیں مگر آپ کی مراد پوری نہیں ہوتی تو آپ **بیاض الاولیاء** کا مطالعہ کیجئے جس میں دعائیں مانگنے، عملیات پڑھنے اور مرادیں پوری ہونے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں، اس کتاب کا ہر ہر وظیفہ دعا عمل اور نقش صدہا اولیاء کرام کا آزمودہ اور مجرب ہے یہ کتاب مراد کی کنجی ہے جس میں ہر قسم کی روحانی و جسمانی بیماریوں کا تیر بہدف سو فیصدی کامیاب اور مجرب علاج درج ہے، اس کتاب کے عملیات سے آپ کی تقدیر بدل جائے گی اور ہر مقصد میں کامیابی ہو گی ہر مراد پوری ہو جائیگی، عمدہ کتابت و طباعت کاغذ اچھا مجلد خوشنما و دیدہ زیب رنگین ٹائٹل قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

آستانہ بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰۶ جامع مسجد دہلی